آپس میں تقسیم ہوگئیں۔ صالح ایوب اور اس سے تعاون کرنے والے سرداروں کے مقابلے میں صالح اسماعیل نے صلیبیوں سے باہمی تعاون کا معاہدہ کرنے سے بھی گریز نہ کیا۔ فطری بات ہے کہ اس تعاون کے لیے صلیبیوں کے بھی کچھ مطالبات تھے۔ سب سے بڑا مطالبہ یہ تھا کہ بیت المقدس ان کے حوالے کیا جائے اور اس کے ساتھ چند اور اہم جنگی مراکز کو بھی حوالے کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ اور واقعی ''صالح اسماعیل'' نے 638ھ میں عسقلان، طبریہ اور نصف صیدا کے علاوہ بیت المقدس بھی ان کے حوالے کر دیا۔ اس اقدام سے مسلمان بہت ناراض ہوئے۔ علمائے کرام نے اسماعیل کے اس اقدام پر سخت تنقید کی جن میں سب سے نمایاں شخصیت دمشق کی جامع مسجد کے خطیب عز بن عبدالسلام کی تھی جو برسرعام منبر پر بلکہ اسماعیل کی موجودگی میں اس مجرمانہ فعل کے بارے میں بات کرتے تھے۔ اس وجہ سے صالح اسماعیل بہت پریشان ہوا اور انھیں قید کر دیا، پھر انھیں دمشق سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ [1]

کچھ قلعوں کے کمانڈروں نے اپنے قلعے صلیبیوں کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا حتی کہ صالح خود وہاں گیا اور ان کا محاصرہ کیا۔ تب انھوں نے قلعے اسماعیل کے حوالے کیے اور اسماعیل نے وہ صلیبیوں کے حوالے کر دیے۔ [2]

صالح اسماعیل کو صلیبیوں سے تعاون کرنے کی وجہ سے خود اس کی اپنی فوج کی طرف سے سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا، چنانچہ بہت سے فوجی دمشق چھوڑ کر چلے گئے اور مصر میں صالح ''ایوب'' سے جا ملے۔ اس وجہ سے اسماعیل اور اس کے حلیف صلیبی کمزور ہوگئے جو صالح ایوب سے لڑنے کے لیے ایک مشترک لشکر لے کر مصر جانا چاہتے تھے۔ صالح ایوب نے خوارزم کے سرداروں سے خط کتابت کی جو اس عرصے میں منگولوں کے دباؤ کی وجہ سے شام پہنچ چکے تھے۔ اس نے ان سے مدد مانگی تو ان کے ہزاروں شہسوار فلسطین کی طرف چل پڑے۔ انھوں نے راستے میں نابلس پر قبضہ کیا اور وہاں سے صلیبیوں کو مار بھگایا، پھر وہ بیت المقدس پہنچے اور 642ھ میں اسے صلیبیوں سے واپس لے لیا اور وہاں موجود صلیبیوں کو بھگا دیا۔ ان کی تعداد تقریباً چھ ہزار تھی۔ وہ عکا کی طرف چل پڑے۔ راستے میں مسلمان ان پر چھاپے مارتے رہے۔ ان میں سے صرف تین سو کے قریب صلیبی عکا پہنچ سکے۔ [3]

---

[1] ابن عماد حنبلی کی شذرات الذهب: 189/5، 302. [2] مفرج الكروب: 302/5، 332، و البداية والنهاية: 155/13، و تاريخ الوطن العربي و الغزو الصليبي: 214. [3] مفرج الكروب: 336/4، و تاريخ الوطن العربي: 214.

خوارزمی اس کے بعد غزہ کی طرف روانہ ہوگئے تاکہ ''صالح اسماعیل'' اور اس کے صلیبی حلیفوں کے خلاف صالح ایوب کی مدد کر سکیں۔ 642ھ میں ایک شدید جنگ ہوئی جس میں صالح اسماعیل اور اس کے فرنگی ساتھیوں کو شکست ہوئی اور وہ قتل یا گرفتار ہوئے۔ مقتولین میں زیادہ تعداد فرنگی صلیبیوں کی تھی۔ شام کا جو لشکر فرنگیوں کی مدد کر رہا تھا، انھیں زیادہ تر گرفتار کیا گیا۔ ''مسلمانوں کی تلواروں نے فرنگیوں کو دبوچ لیا اور انھیں قتل اور گرفتار کر کے ختم کر دیا۔ ان میں سے شاذ و نادر ہی کوئی بھاگ کر بچ سکا۔'' اس معرکے میں تقریباً تیس ہزار صلیبی قتل ہوئے اور ایک ہزار سے زیادہ گرفتار ہوئے جنھیں مصر روانہ کر دیا گیا۔ [1]

یہ معرکہ صلیبیوں سے تعاون کرنے والوں کے لیے کبھی نہ بھولنے والا سبق تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں اور ان سے تعاون کرنے والوں کو ناکام کر دیا۔ بہت سے مسلمان فوجیوں نے ان لوگوں کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا جنھوں نے بیت المقدس کو فرنگی صلیبیوں کے سپرد کر دیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جس وقت فرنگی فوجیوں کے ملنے سے ان لوگوں کی قوت میں اضافہ ہوا، اسی وقت مخلص مسلمان فوجیوں کے انھیں چھوڑ جانے سے ان کی قوت میں کمی بھی ہوئی۔

ان واقعات کے نتیجے میں بیت المقدس، صلیبیوں کے تیسرے اور آخری قبضے کے بعد، پھر مسلمانوں کو مل گیا۔ اس کے بعد جب تک اسلامی خلافت قائم رہی، وہ طویل عرصے تک دوبارہ اس پر قابض نہیں ہو سکے، البتہ عثمانی خلافت کے خاتمے کے بعد انگریزی استعمار نے اس پر قبضہ کر لیا اور پھر انگریزوں اور ان کے ہم نواؤں نے اسے یہودیوں کے حوالے کر دیا۔

معرکۂ غزہ کے بعد اسلامی افواج نے ملکِ شام کو صلیبیوں سے تعاون کرنے والوں سے پاک کر دیا اور انھیں ان علاقوں سے بھگا دیا جہاں وہ حکومت کرتے رہے تھے۔ اس کے بعد شامی لشکر نے عسقلان پر قبضہ کرنے کی کوشش کی اور اس کا محاصرہ کیا لیکن اسے فتح نہ کیا جا سکا۔ ملک الصالح ایوب کی مصری افواج نے 645ھ میں اسے دوبارہ فتح کرنے کی کوشش کی۔ ایک سخت محاصرے کے بعد اپنی کوشش میں کامیابی حاصل کی اور اسے صلیبیوں سے پاک کر دیا۔ [2]

---

[1] البداية والنهاية: 164/13، و مفرج الكروب: 338/5. [2] مفرج الكروب: 378/4، و البداية والنهاية: 173/13، و صلاح الدين أيوبي: 521.

ساتواں اور آخری صلیبی حملہ

''صالح ایوب'' کے دور میں جب مسلمانوں نے بیت المقدس واپس لے لیا تو یورپ میں بہت شور مچا، چنانچہ پوپ انوسنٹ چہارم اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے یورپ کے بادشاہوں کو ایک نئی صلیبی جنگ کے لیے نکلنے کی ترغیب دی۔ فرانس کے بادشاہ لوئی نہم نے اس پکار پر لبیک کہا جو اس دور میں نصرانیت کا سب سے پرجوش حامی بادشاہ تھا اور تین سال سے اس حملے کی تیاری کر رہا تھا، چنانچہ اس کے پاس تقریباً پچاس ہزار جنگجو جمع ہو گئے جن میں متعدد بادشاہ، نواب، یورپ کے بڑے بڑے مذہبی اور سیاسی لیڈر اور فوجی کمانڈر نمایاں تھے۔ مسلمانوں کو 647ھ میں اس فوج کے روانہ ہونے سے پہلے اس کی اطلاع مل گئی تھی، چنانچہ مسلمانوں نے اس کے مقابلے کی تیاری کر لی۔

صلیبیوں کی اس نئی زیادتی کا مقابلہ کرنے کے لیے صالح ایوب نے دفاعی تیاریوں کی بنفس نفیس نگرانی کی، حالانکہ وہ اس وقت سخت بیمار تھا۔ اس حملے کے دوران میں اسی بیماری سے اس کی وفات ہوگئی۔

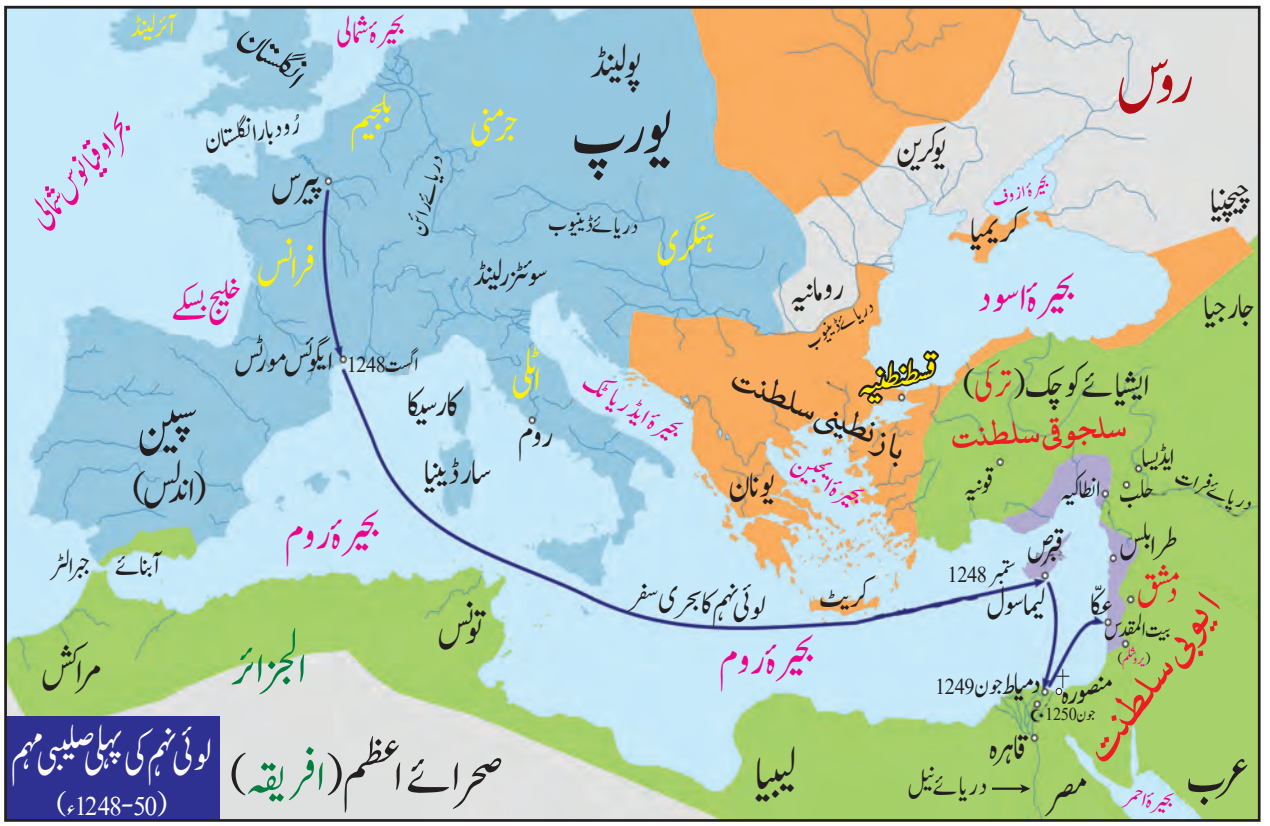

صلیبی ماہ صفر 647ھ میں دمیاط کے قریب پہنچ گئے۔ شہر سے باہر ان کا مقابلہ شہر کی محافظ فوج سے ہوا جس میں صلیبی جیت گئے۔ صلیبیوں کے دمیاط میں داخل ہونے سے پہلے ہی وہاں کی فوجیں شہر سے نکل گئیں۔ اس وجہ سے وہاں کے باشندوں کو بھی شہر چھوڑنا پڑا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صلیبیوں نے کوئی مشقت اٹھائے بغیر شہر پر قبضہ کر لیا۔ انھوں نے شہر کی مسجد کو دوبارہ گرجا بنا دیا۔ [1]

فرانس کے بادشاہ لوئی نہم نے تکبر کا اظہار کرتے ہوئے اور اپنی طاقت پر بھروسا کرتے ہوئے صالح ایوب کو کئی خطوط لکھ کر دھمکیاں دیں کہ وہ مسلمانوں کا قلع قمع کر دے گا۔ صالح ایوب نے اس کا جواب لکھا اور خط کا اختتام اس آیت مبارکہ پر کیا:

﴿وَ سَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ۝﴾

''ظالموں کو جلد ہی معلوم ہو جائے گا کہ وہ کس رخ پلٹتے ہیں۔'' (الشعرآء 227:26)

صالح ایوب نے سخت بیمار ہونے کے باوجود منصورہ میں دفاع کرنے والی مسلمان افواج کو منظم کیا۔ صلیبی دمیاط سے منصورہ کی طرف روانہ ہوئے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے ایسا راستہ اختیار کیا جو پانی سے گھرا ہوا تھا تاکہ مسلمان ان پر حملہ نہ کر سکیں۔ لیکن اچانک ان پر انکشاف ہوا کہ وہ پانی سے گزر کر مسلمانوں تک نہیں پہنچ سکتے۔ تب وہاں کے رہنے والے کچھ مصری عیسائیوں نے انھیں کم گہری جگہ بتائی جہاں سے گزر کر وہ مسلمانوں تک پہنچ گئے۔ صلیبی لوئی نہم اور دوسرے انگریز اور فرانسیسی کمانڈروں کی قیادت میں منصورہ میں داخل ہوئے تو وہاں ایک عظیم معرکہ برپا ہو گیا۔ اس میں مسلمانوں نے بڑی ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا اور غلاموں نے خوب بہادری کے جوہر دکھائے جن میں بیبرس بندقداری بہت نمایاں تھا۔ وہ بعد میں خاندانِ غلاماں کا سب سے مشہور بادشاہ ہوا۔ اس جنگ کے دوران میں صالح ایوب کی وفات ہو گئی لیکن اس کی بیوی شجرۃ الدُّر نے کسی کو خبر نہ ہونے دی تاکہ مسلمان ہمت نہ ہار دیں۔ جنگ زور شور سے جاری رہی جس میں آخر کار مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی۔ انھوں نے صلیبیوں کو قتل بھی کیا اور گرفتار بھی حتی کہ لوئی نہم، دمیاط کی طرف فرار ہونے پر مجبور ہو گیا لیکن مسلمان مجاہدین نے اس کا تعاقب کیا اور اسے گرفتار کر لیا۔ اس کے علاوہ مسلمانوں نے صلیبیوں کے بحری بیڑے پر بھی قبضہ کر لیا اور اس کا کچھ حصہ

---

[1] البداية والنهاية: 177/13، و المواعظ والاعتبار: 219/1، و النجوم الزاهرة: 362/6، و تاريخ الحروب الصليبية: 265.

تباہ بھی ہوگیا اور وہ متکبر بادشاہ مسلمانوں کی قید میں آ گیا۔ [1]

اس نے ماضی میں صالح ایوب اور مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ کیا تھا، اس کے باوجود مسلمانوں نے اس سے قید میں اچھا سلوک کیا اور اس کے احترام کا پورا خیال رکھا، پھر اس شرط پر آزاد کیا کہ صلیبی انخلاء کا وعدہ کریں اور جو فوجی اڈے اب تک ان کے قبضے میں ہیں، انھیں چھوڑ جائیں اور دس سال تک مسلمانوں سے جنگ نہ کرنے کا وعدہ کریں۔ [2]

غلاموں کا صلیبیوں سے جہاد

صالح ''ایوب'' کی وفات کے بعد اس کے بیٹے ''توران شاہ'' کو حکومت ملی لیکن وہ کم سن تھا۔ تھوڑے عرصے بعد اسے پراسرار حالات میں قتل کر دیا گیا، چنانچہ مصر میں خاندانِ غلاماں کو اقتدار حاصل ہوگیا۔ اس طرح ایوبی دور ختم ہوا اور وہ دور شروع ہوگیا جسے ''عصرِ ممالیک'' یا ''خاندانِ غلاماں کا دورِ حکومت'' کہا جاتا ہے۔

ممالیک (غلاموں) نے مصر و شام میں ایوبی حکمرانوں سے آہستہ آہستہ حکومتی اختیارات لینا شروع کر دیے تھے۔ اس عرصے میں غلاموں کے سب سے نمایاں بادشاہ ''سیف الدین قطز'' اور ''الظاہر بیبرس'' تھے۔ اس سے تھوڑا عرصہ پہلے اسلامی دنیا پر منگولوں کا حملہ شروع ہو چکا تھا۔ اس کی ابتدا مشرقی علاقوں سمرقند، بخارا، ''مَرْو'' اور ''ماوراء النہر'' سے ہوئی۔ انھوں نے انسانوں کا ایسا وحشیانہ قتل عام کیا کہ انسانی تاریخ میں اس سے قبل اس کی مثال نہیں ملتی، پھر ان کا رخ مغرب میں فارس اور آذر بائیجان کی طرف ہوگیا، پھر عراق اور الجزیرہ کی باری آئی اور بغداد کی اسلامی خلافت واضح خطرے کی زد میں آ گئی۔ [3] اس کے بعد یہ خطرہ ملک شام کے قریب پہنچ گیا جہاں مسلمانوں اور صلیبیوں کی جنگ جاری تھی، چنانچہ مسلمان اس ہولناک حملے کے واقعات کا جائزہ لینے لگے۔ [4]

---

[1] البداية والنهاية: 178/13، و المواعظ والاعتبار: 219/1، و النجوم الزاهرة: 365/6، و عقد الجمان للعيني: 19، و شذرات الذهب لابن عماد: 239/5، و صلاح الدين الأيوبي: 547، و تاريخ الحروب الصليبية: 270.

[2] شاہ لوئی کی رہائی کے لیے معاوضے میں 10 لاکھ بزانٹ (بازنطینی سکہ) اور اس کے امراء کی رہائی کے معاوضے میں 5 لاکھ فرانسیسی اشرفیاں ادا کرنا طے پایا تھا، پھر نئے ایوبی سلطان توران شاہ نے لوئی کے معاوضے کی رقم سے پانچواں حصہ، یعنی 2 لاکھ بیزانٹ چھوڑ دیے۔ (خونریز صلیبی جنگوں کے سربستہ راز، سرجارج ڈبلیو کارکس، ترجمہ عبدالحلیم شرر، نظر ثانی محسن فارانی: 333، 334) و تاريخ الوطن العربي والغزو الصليبي: 219. [3] آخر کار 656ھ/ 1258ء میں ہلاکو خان نے بغداد پر حملہ آور ہو کر عباسی خلافت کا خاتمہ کر دیا، خلیفہ مستعصم باللہ کو شہید کر ڈالا اور شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ (م ف) [4] دیکھیے: فؤاد الصیاد کی المغول في التاريخ: 61، اسماعیل الخالدی کی العالم الإسلامی والغزو المغولی: 47.

لشکرِ ممالیک جنگِ خروکیتیا میں

شام کو بھی منگولوں کے اس حملے کا نشانہ بننا پڑا۔ صلیبیوں نے اس حملے میں حصہ لیا، کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ اس میں وہ بہرصورت فائدے میں رہیں گے۔ اسی طرح یورپی اور شامی صلیبیوں نے منگولوں سے تعاون کیا۔ مصر پر ساتویں صلیبی حملے کے قائد لوئی نہم، شاہِ فرانس نے بھی ان سے تعاون کیا اور ان کی حوصلہ افزائی کی۔ اس بارے میں ان کے درمیان خط کتابت ہوتی رہی۔ [1]

اس تعاون کا نتیجہ مسلمانوں کے خلاف ایک قسم کے مشترکہ اقدام کی صورت میں سامنے آیا۔ اس میں ارمنی عیسائیوں نے اہم کردار ادا کیا۔ وہ الجزیرہ میں مسلمانوں کے بعض فوجی اڈوں پر حملہ کرنے میں ہلاکو کے لشکر کے ساتھ شریک تھے جن میں ایک فوجی مرکز ''میافارقین'' (ترکی) تھا جو دو سالہ طویل محاصرے کے بعد منگولوں اور ارمنوں کے مشترکہ لشکر کے قبضے میں آیا تھا۔ منگولوں نے وہاں قتل و غارت اور تخریب کاری کی۔ وہاں سے منگول اور ان کے حلیف ارمن ''ماردین'' چلے گئے اور اس پر بھی قبضہ کر لیا، پھر انھوں نے ''نصیبین'' پر قبضہ کیا اور شام کے شمال مشرقی حصے میں متعدد قلعوں پر قابض ہو گئے۔ یہ واقعات 657ھ میں پیش آئے۔ [2]

---

[1] تاريخ الحروب الصليبية: 264، 278. [2] العالم الإسلامي والغزو المغولي: 95-98.

اس کے بعد منگول افواج حلب کے گرد جمع ہوگئیں۔ وہاں کے عیسائیوں نے ان کا گرم جوشی سے استقبال کیا۔ انھوں نے شہر پر منگولوں اور ان کے ساتھی عیسائیوں کا قبضہ ہونے میں اپنا کردار ادا کیا۔ منگول وہاں چھ دن قتل عام میں مشغول رہے۔ انھوں نے ایک ہزار سے زیادہ مسلمان خواتین اور بچوں کو پکڑ لیا جنھیں شام اور یورپ کے صلیبی بازاروں میں فروخت کر دیا گیا۔ انھوں نے مسلمانوں کی مساجد کی بے حرمتی کی۔ ارمنی عیسائی بادشاہ ہیثوم نے حلب کی جامع مسجد کو خود آگ لگائی۔ [1]

حلب شہر کے چھن جانے سے شام کے مسلمان مزید خوف زدہ ہوگئے، چنانچہ ہزاروں مسلمان مصر کی طرف ہجرت کر گئے اور بعض ایوبی سردار جان بچا کر بھاگ گئے، مثلاً دمشق کے امیر ''ملک ناصر ایوبی'' سے یہ حرکت سرزد ہوئی اور کچھ مسلمان سرداروں نے ہتھیار ڈال دیے جس کی وجہ سے شام کے مسلمانوں کی کوئی حیثیت نہ رہی۔

دمشق کا قلعہ چالیس دن کے مقابلے کے بعد زیر ہوگیا۔ منگولوں اور صلیبیوں نے وہاں کے مسلمانوں کو شہید کر دیا۔ ان کا مال و متاع چھین لیا اور انھیں طرح طرح کی تکلیفیں دیں۔ خود دمشق کے وہ عیسائی بھی اس کام میں پیچھے نہ رہے جو مسلمانوں کے زیر سایہ اور ان کی حفاظت میں پرامن زندگی گزار رہے تھے۔ جب منگولوں نے شہر فتح کر لیا تو عیسائی اپنے مذہبی گیت گاتے ہوئے گلیوں اور بازاروں میں گھومنے لگے۔ وہ دمشق کی گلیوں اور بازاروں میں ناقوس بجاتے پھرتے تھے تاکہ مسلمانوں کو زیادہ اذیت پہنچے۔ بلکہ انھوں نے ماہ رمضان میں دن کے وقت دمشق کی مسجدوں میں شراب نوشی کی اور مسجدوں میں شراب انڈیلی اور منگولوں کی حمایت سے بعض مسجدوں کو گرجا گھروں میں تبدیل کر دیا۔ وہ صلیبیں اٹھا کر مسلمانوں کے پاس سے گزرتے تھے اور انھیں صلیب کے احترام میں کھڑا ہونے پر مجبور کرتے تھے۔ [2]

اسی طرح شام کے صلیبیوں نے بلکہ وہاں کے تمام عیسائیوں نے وحشی حملہ آور منگولوں کے ساتھ تعاون کا ثبوت دیا۔ انھیں اگر خیال تھا تو خوں ریزی، دنگا فساد اور زندگی کے تمام مظاہر کو تہس نہس کر دینے کا اور اس کی وجہ محض وہ کینہ تھا جو ان کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف بھرا ہوا تھا اور اب تک بھرا ہوا ہے۔ صلیبیوں کا منگولوں سے یہ تعاون بھی صلیبی جنگوں کا ایک حصہ ہے۔ بلکہ بعض مؤرخین اس سے بڑھ کر یہ بھی

---

[1] النجوم الزاهرة: 47/7. [2] البداية والنهاية: 219/13، و السلوك: 418/1، و تاريخ الوطن العربي والحروب الصليبية: 223.

ممالیک کے مقبرے

کہتے ہیں کہ شام پر منگولوں کے حملے کے پیچھے بھی صلیبیوں کی منصوبہ بندی اور ان سے رابطہ تھا جس کا مقصد منگولوں کی طاقت سے فائدہ اٹھا کر بیت المقدس پر قبضہ کرنا اور مسلمانوں کو وہاں سے نکالنا تھا۔ [1]

ساحلی علاقے کے صلیبیوں نے عین جالوت کے معرکے سے تھوڑا پہلے مسلمانوں سے جنگ بندی کا معاہدہ کیا تھا۔ [2] اس کی پابندی کرتے ہوئے وہ مسلمانوں اور منگولوں کی جنگ میں غیر جانب دار رہے تھے حتی کہ معرکہ ختم ہوگیا۔ تب اسلامی جہاد کا رخ براہِ راست صلیبیوں کی طرف ہوگیا۔ سیف الدین قطز کی وفات کے بعد اس مرحلے میں جہاد کی قیادت ''الظاہر بیبرس'' نے کی۔ اس نے اپنے دس سالہ دور حکومت میں، جس کی ابتدا 659ھ میں ہوئی، کئی جنگیں لڑیں۔ اب چونکہ یورپ سے بڑے صلیبی لشکر آنا بند ہوگئے تھے، اس لیے یہ جنگیں شام میں باقی ماندہ صلیبیوں سے ہوئیں۔ شام کے عربی اور ارمنی عیسائی اور فرنگیوں میں سے باقی بچے ہوئے صلیبی جنھوں نے اس مرحلے میں خود کو منگول قوت سے وابستہ کر لیا تھا، ان کی ہمت ٹوٹنے میں ''عین جالوت'' کی جنگ کا اثر بہت نمایاں تھا، چنانچہ ان کی شکست سے یہ بھی کمزور ہوگئے۔ [3]

---

[1] تاريخ الوطن العربي والغزو الصليبي:221، و المغول في التاريخ: 297، و تاريخ الحروب الصليبية:261.

[2] اس موضوع پر زیر مطالعہ کتاب میں دوسری جگہ بات کی گئی ہے۔ [3] تاريخ الحروب الصليبية:284.

اس کے علاوہ اس جنگ کے نتیجے میں مصر کو تمام عالم اسلام میں بے مثال قائدانہ مقام مل گیا کیونکہ بغداد کی خلافت 656ھ میں بغداد پر منگولوں کے قبضے اور آخری خلیفہ ''مستعصم باللہ'' کے قتل کے نتیجے میں ختم ہوچکی تھی۔ ''ظاہر بیبرس'' نے مصر اور شام کو متحد کرنے کی کوشش کی اور اس مقصد کے لیے بعض مخالف سرداروں نے جان چھڑائی اور شام کے اکثر علاقوں کو مصر کی خاندانِ غلاماں کی حکومت کا دوست بنا لیا جس کا نمایندہ اس وقت بادشاہ ''ظاہر بیبرس'' تھا۔ اس نے مصر میں بغاوت کی بعض کوششوں کا خاتمہ کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کی توجہ صلیبیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اسلامی طاقت کی تیاری پر بھی مرکوز رہی۔ اس نے لشکر ترتیب دیے، شام کے قلعوں کو مضبوط کرنے اور ان میں اسلحہ اور فوج جمع کرنے کا اہتمام کیا۔ اس دوران میں اس نے اناطولیہ میں صلیبیوں اور منگولوں کے مقابلے میں اسلامی سلجوقی قوتوں سے تعاون کا معاہدہ کیا کیونکہ بیبرس کو اکثر اوقات بیک وقت دو دشمنوں سے مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔ صلیبی تو مسلمانوں کے روایتی دشمن تھے۔ انھوں نے جب وحشی منگولوں سے تعاون کیا تو ان کے بارے میں خاص اور محتاط پالیسی ترتیب دینا ضروری ہوگئی۔ شام کا ساحل اب تک مختلف قوتوں اور حجم کے حامل صلیبی مراکز اور قلعوں سے بھرا ہوا تھا۔ ان عیسائیوں نے جب مسلمانوں کو منگولوں پر فتح پاتے دیکھا تو وہ سوچنے لگے کہ اب اسلامی جہاد کا رخ ان کی طرف ہونے والا ہے۔ انھیں محسوس ہوا کہ اس مرحلے میں وہ میدان میں اکیلے ہوں گے کیونکہ ساتویں صلیبی حملے میں فرنگیوں کے شکست کھانے کے بعد اور شاہ فرانس لوئی نہم کی گرفتاری کے بعد یورپ کے صلیبیوں کو مسلمانوں پر فتح پانے کی کوئی امید نہ رہی تھی۔ اس کے نتیجے میں یورپ کا صلیبیوں سے تعاون کافی کم ہوگیا تھا۔

صلیبیوں نے جنگ بندی کے لیے غلاموں سے مذاکرات شروع کیے تو ظاہر بیبرس نے اس مطالبے پر زور دیا کہ تمام مسلمان قیدی آزاد کیے جائیں اور صلیبی ان تمام فوجی اڈوں کو چھوڑ کر پیچھے ہٹ جائیں جنھیں مسلمان ''صلاح الدین'' کے دور میں فتح کر چکے تھے۔ انھوں نے یہ مطالبات تسلیم کرنے سے انکار کر دیا لیکن اس امر پر اتفاق کیا کہ فریقین تمام قیدیوں کو رہا کر دیں گے، چنانچہ مسلمانوں نے صلیبی قیدی آزاد کر دیے لیکن انھوں نے عہد شکنی کی اور مسلمانوں کے وہ قیدی آزاد نہ کیے جن پر اتفاق ہو چکا تھا۔[1]

جب صلیبیوں کو خبر ملی کہ بادشاہ ظاہر بیبرس ان سے جنگ کرنے کے لیے ان کی طرف روانہ ہونے کو واقعی تیار ہے تو وہ دوبارہ آ گئے اور ان شروط کو تسلیم کرنے کا اقرار کیا جو ظاہر بیبرس نے پہلے پیش کی تھیں

---

[1] تاریخ الحروب الصلیبیة: 283.

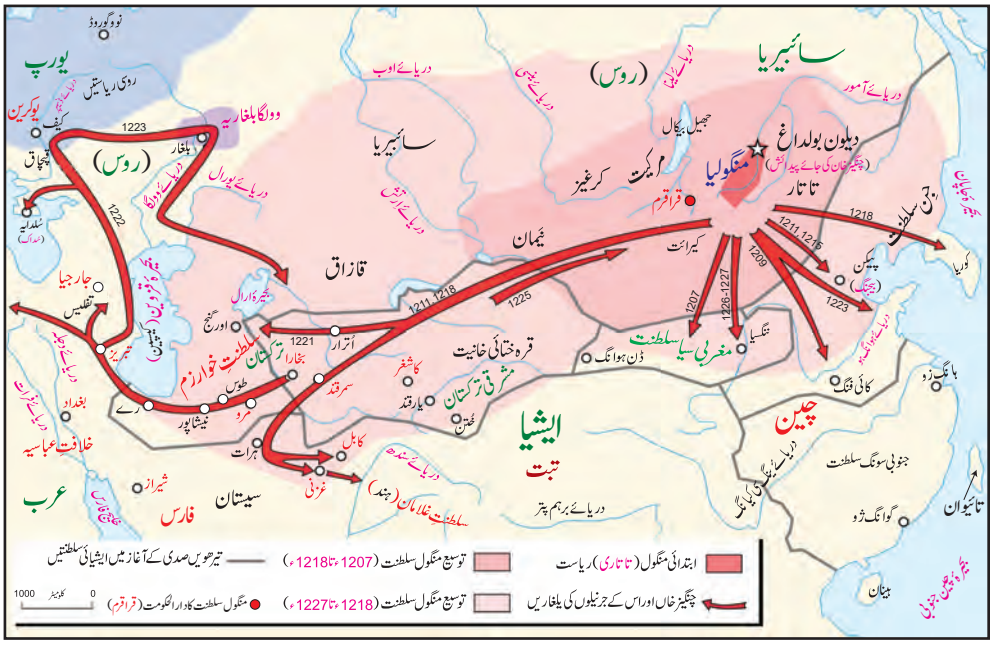

لیکن ہیپرس نے یہ کہہ کر جنگ بندی سے انکار کر دیا کہ اب اس کا وقت گزر چکا ہے کیونکہ انھوں نے قیدی رہا کرنے کی شرط پوری نہیں کی، پھر مسلمان افواج جنگ کے لیے کچھ قلعوں کی طرف روانہ ہوگئیں۔ [1]

ہیپرس نے مختلف برسوں میں شام میں مختلف صلیبی اڈوں پر بار بار حملے کیے جن میں عکا اور اس کے قریبی قلعوں پر حملہ زیادہ اہمیت کا حامل ہے جو 661ھ مطابق 1263ء میں کیا گیا۔ اس نے قیساریہ پر بھی حملہ کیا اور اسے فتح کر لیا۔ یہ حملے صرف تنبیہ کے طور پر کیے گئے تھے اور ان میں کئی اہم مقامات فتح ہوئے، تاہم ان کے ذریعے سے عیسائیوں کو عکا سے بے دخل نہ کیا جاسکا۔ یہ اس علاقے میں ان کا اہم ترین فوجی مرکز تھا۔ اس کے جواب میں صلیبیوں نے بعض اسلامی مراکز پر حملے کیے جن میں سے ایک بیسان تھا۔ انھوں نے وہاں قتل و غارت کی اور بہت سی غنیمت بھی حاصل کی جس سے انھیں بعض مقامات پر مقابلے میں ٹھہرنے کا موقع ملا۔ [2]

ظاہر ہیپرس نے 663ھ (مطابق 1265ء) میں شامی ساحل کے صلیبیوں پر دوبارہ حملے کی تیاری کی۔ اس بار اس نے بعض خاص اڈوں اور قلعوں پر قبضہ کرنے کی کوشش کی، چنانچہ شدید معرکوں کے بعد وہ

---

[1] السلوك: 525/1، و تاريخ الحروب الصليبية: 283. [2] تاريخ الوطن العربي والحروب الصليبية: 234، و تاريخ الحروب الصليبية: 258.

قیساریہ کو ایک بار پھر واپس لینے میں کامیاب ہوگئے۔ [1]

جب یافا کے صلیبیوں کو خبر ملی کہ مسلمان ان کی طرف پیش قدمی کر رہے ہیں تو وہ شہر چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اس طرح مسلمانوں نے اسے آزاد کرا لیا۔ بیبرس نے عکا فتح کرنے کی کوشش کی لیکن صلیبیوں کو قبرص سے کمک پہنچ جانے کی وجہ سے وہ مسلمانوں کے مقابلے میں ڈٹ گئے، چنانچہ بیبرس کو اگلے سال تک محاصرہ اٹھانا پڑا کیونکہ سردی کا موسم شروع ہوگیا تھا۔ [2]

ارمنی بادشاہ ''ہیثوم'' نے منگولوں کے ساتھ سب صلیبیوں سے بڑھ کر تعاون کیا تھا۔ شام پر حملہ کرنے میں وہ اپنی فوجوں سمیت ذاتی طور پر ان کی اگلی صفوں میں شریک تھا۔ اس کے علاوہ اس نے حلب کی بربادی اور وہاں مسلمانوں کے قتل عام میں بھی حصہ لیا تھا، اس لیے بیبرس نے اسے سزا دینے کے لیے خاص طور پر ایک لشکر روانہ کیا جو 662ھ مطابق 1266ء میں الناصر ''قلاوون'' کی قیادت میں آرمینیا کی طرف روانہ ہوا۔ مسلمانوں اور آرمینیا والوں میں جنگ ہوئی جس میں ارمنی فوج کو شکست ہوئی۔ بادشاہ ہیثوم کا ایک بیٹا قتل ہوگیا، دوسرا گرفتار ہوگیا۔ اس کے علاوہ ان کے تقریباً چالیس ہزار فوجی قید ہوئے۔ مسلمانوں نے آرمینیا کے کئی قلعوں پر قبضہ کر لیا اور کئی قلعے ارمنی بادشاہ کو اپنا بیٹا چھڑانے کے لیے مسلمانوں کے حوالے کرنے پڑے۔ اس طرح آرمینیا کی قوت کم ہوگئی اور انھیں حملہ آوروں کا ساتھ دینے کی سزا مل گئی۔ [3]

شام اور آرمینیا میں مسلمانوں کی مسلسل فتوحات کی وجہ سے بعض صلیبی سردار مسلمانوں کے تمام مطالبات تسلیم کرنے پر مجبور ہوگئے۔ اس کے بدلے میں وہ ایک محدود مدت کے لیے جنگ بندی کرنا چاہتے تھے۔ ان میں بیروت کی ملکہ ازابیلا بھی شامل تھی۔ ظاہر بیبرس کا صلیبیوں کے خلاف ایک اہم جہادی حملہ رمضان 666ھ مطابق 1268ء میں انطاکیہ پر حملہ ہے۔ مسلمانوں نے اس پر خشکی اور سمندر کی طرف سے حملہ کیا اور ان کی امداد کے راستے روک دیے۔ انھوں نے تین دن کا الٹی میٹم دیا۔ اس کے بعد بری اور بحری محاصرہ سخت کر دیا حتی کہ دفاع کرنے والے مایوس ہوگئے، پھر مسلمان ان کی فصیلوں کے اوپر سے گزر کر ان تک پہنچ گئے اور ان سے شدید جنگ ہوئی۔ آخر کار مسلمانوں کو فتح ہوئی اور وہ صلیبیوں کو بھگا کر شہر کو ان سے واپس لینے میں کامیاب ہوگئے اور اس شہر پر صلیبیوں کا پونے دو سو سالہ قبضہ ختم ہوگیا۔ [4]

---

[1] البداية والنهاية: 244/13، ابن الوردی کی تاریخ: 310/2، وعقد الجمان: 396. [2] تاريخ الوطن العربي والغزو الصليبي: 234، و تاريخ الحروب الصليبية: 284. [3] النجوم الزاهرة: 141/7، و عقد الجمان: 384، و البداية والنهاية: 251/13، و تاريخ الوطن العربي والغزو الصليبي: 235. [4] السلوك: 567/1، و البداية والنهاية: 251/13.

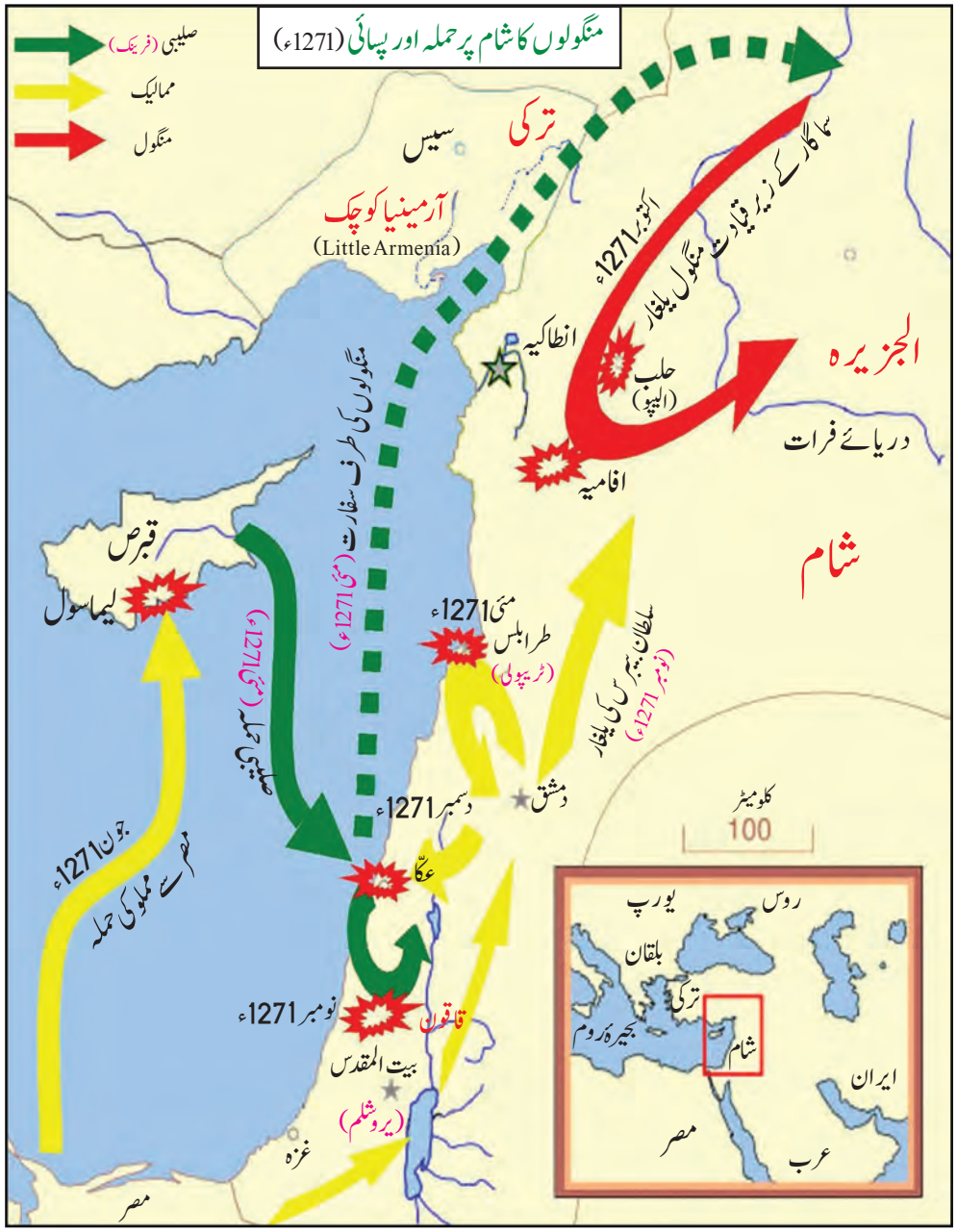

انطاکیہ کی ریاست کی آزادی صلیبیوں کے لیے انتہائی تکلیف دہ چوٹ تھی کیونکہ یہ سب سے قدیم صلیبی ریاست تھی جو پہلے صلیبی حملے کے نتیجے میں قائم ہوئی تھی۔ مسلمانوں نے اس ریاست کے متعدد صلیبی قلعے بھی فتح کر لیے جو اسلامی شام کے اہم شہروں، حلب وغیرہ کے لیے خطرہ بنے ہوئے تھے۔ انطاکیہ اور اس

کے قرب و جوار کا علاقہ مسلمانوں کو واپس مل جانے سے خشکی کا وہ راستہ منقطع ہوگیا جس کے ذریعے سے شام کے صلیبی مراکز کا آرمینیا اور بازنطینی سلطنت سے رابطہ قائم تھا۔ اس سے باقی ماندہ صلیبی اڈے بھی کمزور ہوگئے جن میں طرابلس اور عکا کے مراکز اہم ترین تھے۔

انطاکیہ کی آزادی سے شام کی دوسری صلیبی ریاستوں میں ایک قسم کا اتحاد پیدا ہوگیا تھا، بالخصوص عکا اور طرابلس میں جو باقی ماندہ صلیبی ریاستوں میں سب سے اہم تھیں۔ اس اتحاد میں قبرص بھی شامل ہوگیا تاکہ اسلامی جہاد کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک متحدہ صلیبی محاذ قائم کیا جائے۔ مغربی یورپ، بالخصوص فرانس سے جنگجوؤں کے کچھ جتھے آگئے تاکہ اسلامی حملوں کو روکنے میں مدد دے سکیں لیکن وہ اپنا کوئی مقصد حاصل نہ کر سکے۔ خاص طور پر فرانس کے بادشاہ لوئی نہم کا حملہ جو شام کے ساحل تک پہنچنے سے پہلے ہی ایک بار پھر تیونس میں دم توڑ گیا۔ [1]

بیبرس نے 669ھ (1270ء) میں طرابلس پر حملہ کیا اور اس کے کئی قلعے فتح کر لیے لیکن وہ عکا کو فتح کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ اسے عکا کے بادشاہ ہوہیمنڈ ششم سے معاہدہ کرنا پڑا۔ بیبرس نے صقلیہ (سسلی) کے بادشاہ سے بھی صلح کر لی لیکن اس نے معاہدے کی پاسداری نہ کی اور بیبرس کے کچھ ایلچیوں کو تنگ کیا۔ مسلمانوں نے بحری بیڑے کے ذریعے سے قبرص پر حملہ کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوئے۔ [2]

بادشاہ ظاہر بیبرس معاہدہ ہونے کے باوجود قوت تیار کرتا رہا اور بحری جہاز تیار کرتا رہا تاکہ قبرص پر حملے کے نقصانات کی تلافی کر سکے۔ اس دوران میں وہ صلیبیوں کے ساحلی ٹھکانوں پر حملے کرتا رہا جنھوں نے مسلمانوں سے صلح نہیں کی تھی۔

676ھ میں ظاہر بیبرس فوت ہوگیا لیکن اس وقت تک وہ شام میں صلیبیوں کے تسلط کو بہت محدود کر چکا تھا۔ وہ صرف چند ساحلی مقامات پر قابض تھے۔ اس کے پے در پے حملوں کے نتیجے میں شام کے نقشے سے عیسائیوں کا مکمل خاتمہ یقینی محسوس ہونے لگا۔ اور یہ کام بیبرس کی وفات کے بعد خاندانِ غلاماں کے بادشاہوں نے کیا۔

---

[1] لوئی نہم کی فوج سمندری طوفان میں گھر کر قرطاجنہ (تیونس) کی جگہ جا خیمہ زن ہوئی تھی کہ اچانک ایک وبا شروع ہوئی جس نے سیکڑوں فرانسیسی فوجیوں اور خود بادشاہ لوئی کا بھی خاتمہ کر دیا۔ (خونریز صلیبی جنگوں کے سربستہ راز: 340) و تاريخ الوطن العربي و الغزو الصليبي: 236، و تاريخ الحروب الصليبية: 258. [2] البداية و النهاية: 259/13، و ابن الوردی کی تاریخ: 314.

صلیبیوں کے آخری گڑھ کا خاتمہ

صلیبیوں اور مسلمانوں کی زور آزمائی جو صلیبی جنگوں کے نام سے مشہور ہے، سلطان ناصر قلاوون کے دور میں اپنے آخری مراحل میں داخل ہوگئی۔ اس نے بیبرس کی وفات کے بعد حکومت سنبھالی۔ قلاوون کی توجہ مصر اور شام کی اسلامی صفوں کو متحد کرنے اور بعض سرداروں کی طرف سے علیحدگی کی کوششوں کا خاتمہ کرنے پر مرکوز رہی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے اسلامی افواج کو منظم کرنے اور انھیں سامانِ جنگ مہیا کرنے کی پالیسی پر عمل پیرا رہنے کی کوشش کی۔ اس وجہ سے باقی ماندہ صلیبیوں نے قلاوون سے معاہدے کرنے کی کوشش کی۔ اس سے جو بات سب سے نمایاں طور پر واضح ہوتی ہے، وہ صلیبیوں کی طاقت کا کمزور ہونا ہے۔ وہ یہاں تک تسلیم کرنے کو تیار ہوگئے تھے کہ سلطان قلاوون کا ایک نمایندہ ان کے درمیان موجود رہے جو ان کی زمینوں کا نصف خراج وصول کرے۔ اس کے علاوہ قلاوون نے یہ بھی کوشش کی کہ شام کے صلیبیوں کو

یورپ سے مدد ملنے کا سلسلہ ختم ہوجائے۔ اس مقصد کے لیے اس نے اپنے ہم عصر یورپی بادشاہوں سے معاہدے کیے، چنانچہ ان بادشاہوں کی طرف سے صلیبیوں کی مدد کا جوش ٹھنڈا ہوگیا۔ [1]

سلطان قلاوون نے 688ھ میں ایک بڑی فوج تیار کی جس میں مصر اور شام کی افواج شامل تھیں۔ بہت سے علماء، قاضی اور رضا کار مجاہدین بھی اس میں شامل تھے۔ [2]

مسلمانوں نے سمندر اور خشکی کی طرف سے طرابلس کا محاصرہ کرلیا اور ان پر انیس منجنیقوں سے گولہ باری شروع کر دی۔ قبرص کے کچھ جہازوں نے محصورین کی مدد کرنے کی کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہ ہوسکے۔ محاصرہ ایک مہینے سے زیادہ دیر تک جاری رہا جس کے بعد مسلمان قوت کے بل پر طرابلس میں داخل ہوگئے اور اس پر اپنا قبضہ قائم کرلیا۔ بہت سے صلیبی قتل ہوئے یا مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہوگئے۔ قلاوون نے شہر کے دفاعی انتظامات کو بے کار کر دیا۔ قلعوں اور فصیلوں کو منہدم کر دیا تاکہ صلیبی دوبارہ ان سے فائدہ نہ اٹھا سکیں۔ 688ھ میں طرابلس کی فتح قلاوون کا ایک اہم کارنامہ شمار ہوتا ہے کیونکہ یہ ایک سو اسی سال سے زیادہ مدت تک عیسائیوں کے قبضے میں رہا تھا۔ قلاوون نے طرابلس فتح کرنے کے فوراً بعد لبنانی ساحل کے بعض اہم مقامات فتح کر لیے جن میں جبلہ، بیروت اور ان کے آس پاس کے قلعے شامل ہیں۔ [3]

689ھ میں جب سلطان قلاوون کی وفات ہوئی تو شام کا اکثر علاقہ صلیبیوں سے پاک ہو چکا تھا اور عکا کے سوا ان کا کوئی مضبوط ٹھکانا باقی نہیں رہا تھا۔ اس کے بعد اس کے بیٹے الاشرف خلیل نے حکومت سنبھالی جس نے اپنے دورِ حکومت میں صلیبیوں کا آخری قلعہ بھی مسمار کر دیا۔ اس کی جدوجہد سب سے زیادہ عکا کی حکومت ختم کرنے پر مرکوز تھی جو ان دنوں صلیبیوں کا سب سے بڑا گڑھ بن چکا تھا۔

عکا کی ریاست نے سلطان بیبرس کے ایام ہی سے مسلمانوں سے معاہدہ کیا ہوا تھا لیکن جب مسلمانوں نے طرابلس فتح کر لیا تو عکا نے خطرہ محسوس کرتے ہوئے یورپ سے مدد مانگ لی، چنانچہ یورپ کے اطراف و اکناف سے امدادی فوجیں پہنچنے لگیں تاکہ مسلمانوں سے مقابلہ کرنے کے لیے جان توڑ کوشش کی جائے۔ نئے یورپیوں نے مسلمانوں کا بالکل لحاظ نہ کیا اور ان سے کیے ہوئے معاہدے بھی فراموش کر دیے۔ عکا میں جو مسلمان تاجر موجود تھے، انھیں قتل کر دیا اور شہر کے قریب کی مسلمان بستیوں پر حملہ کر دیا۔

---

[1] تاريخ الوطن العربي والغزو الصليبي: 240، و تاريخ الحروب الصليبية: 287. [2] البداية والنهاية: 312/13، و ابن الوردی کی تاریخ: 326. [3] السلوك: 748/1 و النجوم الزاهره: 378/7، و البداية والنهاية: 312/13، و ابن وردی کی تاریخ: 334.

انھوں نے وہاں کے بہت سے باشندوں کو شہید کر دیا اور علاقے میں فساد برپا کیا، چنانچہ سلطان خلیل عکا پر حملہ کرنے کی تیاری کرنے لگا۔ جب عکا والوں کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے مسلمانوں سے معذرت کرنے کی کوشش کی لیکن سلطان خلیل نے ان کی معذرت قبول نہ کی۔ [1]

سلطان نے سامانِ حرب تیار کرنا شروع کر دیا اور عکا پر حملہ کرنے کے لیے شام میں لشکر جمع کرنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی سلطان نے قاہرہ میں علماء اور فقہاء کو جمع کیا اور عوام سے درخواست کی کہ وہ مسلمانوں کی فتح کے لیے دعائیں کریں۔ اس نے شام کی طرف روانہ ہونے سے پہلے ضرورت مندوں اور غریبوں میں بہت سا مال صدقہ کیا، پھر سلطان نے عکا کے قریب پہنچ کر پڑاؤ ڈال دیا۔ شام کے کئی شہروں سے محاصرہ کرنے کے لیے ضروری سامان بھی پہنچ گیا۔ اس محاصرے میں مسلمانوں کی منجنیقوں کی تعداد بانوے تک پہنچ گئی تھی جبکہ اس دوران میں عکا کو مسلمانوں سے بچانے کے لیے یورپ سے امدادی افواج کثرت سے

[1] السلوك:762/1، و النجوم الزاهرة:7/8.

آ رہی تھیں۔ عیسائیوں نے اپنے دفاع کے لیے بہت بہادری کا مظاہرہ کیا، تاہم مسلمانوں نے محاصرہ مزید سخت کر دیا۔ سلطان کئی دن تک جنگ کی نگرانی خود کرتا رہا۔ 17 ربیع الآخر 690ھ کو چالیس دن کے محاصرے کے بعد عکا پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا۔ انھوں نے وہاں کے صلیبیوں کو قتل اور گرفتار کیا۔ جو بچ گئے، وہ سمندر میں یورپ کی طرف بھاگ گئے۔ ان میں سے بہت سے لوگ سمندر میں ڈوب کر مر گئے۔ [1]

عکا فتح کرنے کے بعد مسلمان شام میں صلیبیوں کے دوسرے مقامات پر قبضہ کرنے لگے۔ انھوں نے ''صور''، ''حیفا'' اور ''عثلیث'' وغیرہ پر قبضہ کر لیا۔ جو علاقے واپس لیے تھے، ان کے قلعوں اور فصیلوں کو منہدم کرنے لگے تاکہ فرنگی سمندر کی طرف سے واپس آ کر ان قلعوں میں نہ آ بیٹھیں۔ [2]

عکا کی فتح کو ابھی دو مہینے کی مدت نہیں گزری تھی کہ پورا شام فرنگی صلیبیوں کی نجاست سے پاک ہوگیا۔ ان میں سے ایک فرد بھی وہاں باقی نہ رہا۔ انھیں شام اور مسلمانوں کے دیگر علاقوں سے آخری بار نکال دیا گیا۔ اس پر بہت سے شعراء نے اشعار کہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ زَالَتْ دَوْلَةُ الصَّلْبِ وَعَزَّ بِالتُّرْكِ دِينُ الْمُصْطَفَى الْعَرَبِي

هٰذَ الَّذِي كَانَتِ الْاٰمَالُ لَوْ طُلِبَتْ رُؤْيَاهُ فِي النَّوْمِ لَاسْتَحْيَتْ مِنَ الطَّلَبِ

مَا بَعْدَ عَكَا وَقَدْ هَدَّتْ قَوَاعِدُهَا فِي الْبَحْرِ لِلتُّرْكِ عِنْدَ الْبَرِّ مِنْ أَرَبِ

لَمْ يَبْقَ مِنْ بَعْدِهَا لِلْكُفْرِ إِذْ خَرِبَتْ فِي الْبَحْرِ وَالْبَرِّ مَا يُنْجِي مِنَ الْهَرَبِ

''اللہ کا شکر ہے کہ صلیبیوں کی ریاست ختم ہوگئی اور ترکوں کے ذریعے سے نبی عربی مصطفی (ﷺ) کے دین کو عزت مل گئی۔ یہ ایسی امیدیں ہیں کہ اگر انھیں خواب میں نظر آنے کو کہا جاتا تو وہ اس مطالبہ (کو پورا کرنے) سے شرم محسوس کرتیں۔ جب سمندر میں عکا کی بنیادیں ٹوٹ پھوٹ گئیں تو اس کے بعد ترکوں کو خشکی میں بھی کوئی خواہش باقی نہ رہی (جو پوری نہ ہوئی ہو)۔ اس کے ویران ہونے کے بعد کافروں کے لیے سمندر میں یا خشکی پر کوئی ایسی جگہ نہ رہی جو انھیں بھاگنے سے بچا سکے۔''

اس کے بعد قصیدہ کے مزید اشعار ہیں۔ [3]

---

[1] النجوم الزاهرة: 8/8، 11 و البداية والنهاية: 320/13، و ابن الوردی کی تاریخ: 336، 337، و صلاح الدين الأيوبي: 788، و البداية والنهاية: 321/13. [2] السلوك: 764/1-766، و البداية والنهاية: 321/13، و صلاح الدين الأيوبي: 604. [3] البداية والنهاية: 323/13.

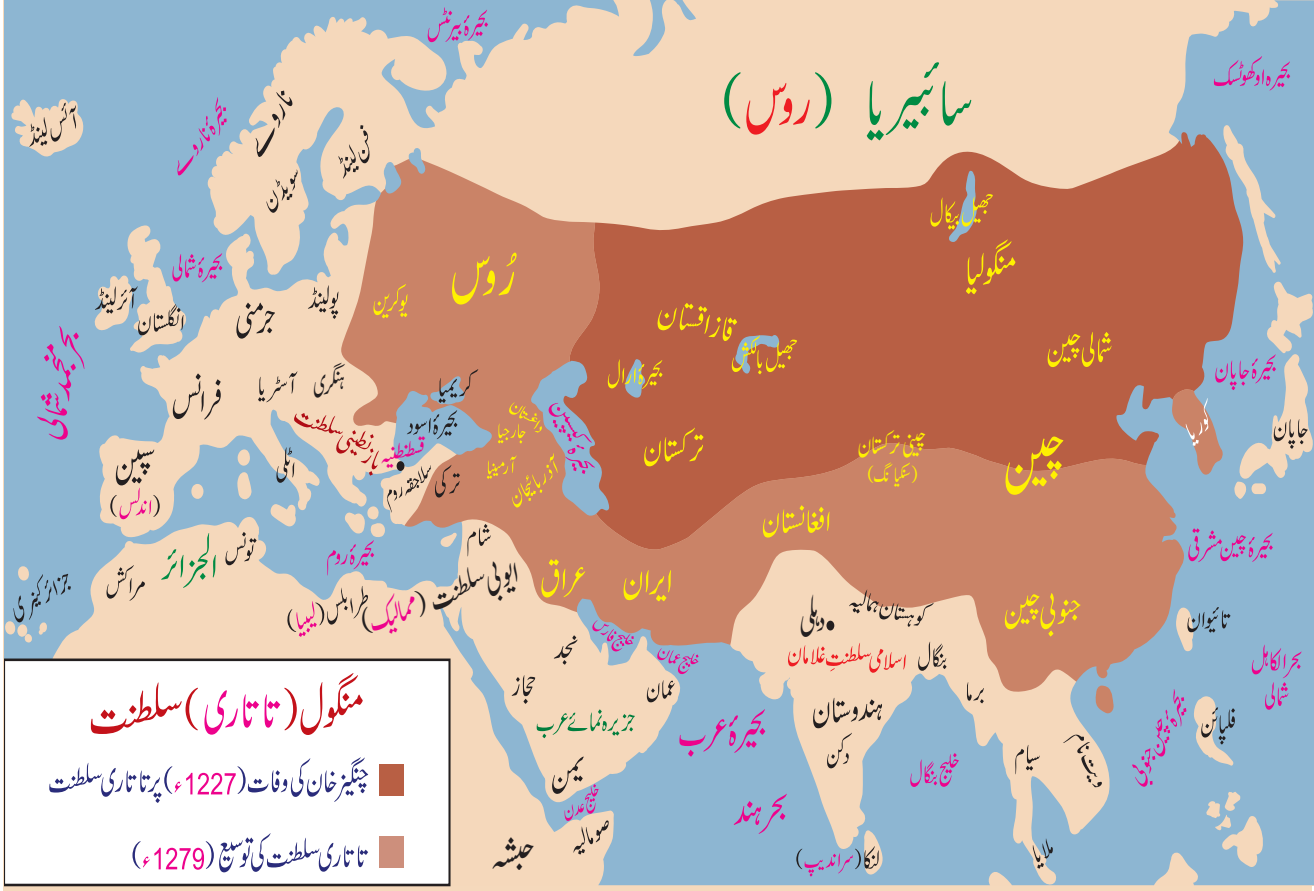

6

عالم اسلام پر منگولوں کی لشکر کشی

عالم اسلام پر منگولوں کی لشکر کشی

ساتویں صدی ہجری کے پہلے چوتھائی حصے میں اسلامی دنیا پر چند مشرک منگول یا تاتاری قبائل کے شدید حملوں کی صورت میں ایک آفت آئی۔ یہ قبائل شامانی مذہب کے پیرو تھے جس میں مظاہر فطرت کی پوجا کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ ان میں ایک مضبوط سیاسی تحریک برپا ہوئی جس کا لیڈر چنگیز خاں تھا۔ اس نے کچھ قاعدے قانون وضع کیے جن کے مطابق ان کی زندگی گزرنے لگی۔ یہ ''یاسا'' کے نام سے معروف ہیں۔

منگول حملے سے پہلے اسلامی دنیا تقسیم اور انتشار کی وجہ سے عام ضعف کا شکار تھی۔ ان کے بہت سے رہنما اور لیڈر تھے۔ وہ بہت خودغرض تھے۔ اپنے معمولی مفادات کا حصول ہی ان کا مطمح نظر تھا۔ وہ ذاتی مفادات کو اجتماعی مفادات پر ترجیح دیتے تھے۔ ان میں عیش وعشرت، خواہش پرستی اور لہو ولعب کا غلبہ تھا۔ ان کی اخلاقی حالت کمزور تھی اور شجاعت کا فقدان تھا۔ علاوہ ازیں عوام میں بدعات کی کثرت تھی۔ ان کے اخلاق اور کردار کمزور تھے۔[1]

---

[1] العالم الإسلامي والغزو المغولي:43.

منگول سلطنت آلتین اوردہ (زریں خانوادہ) کا قدیم دارالسلطنت سرائے باتو (روس)

مشرق میں منگولوں کا سامنا متعدد سیاسی قوتوں سے ہوا۔ ان میں سے ایک خوارزم کی سلطنت تھی۔ اس میں فارس اور خراسان کے وہ علاقے بھی شامل تھے جنھیں آج کل ایران کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ غوری سلطنت تھی جو خوارزم شاہی سلطنت کے جنوب میں افغانستان، شمالی ہند، سندھ اور اس کے قرب و جوار کے علاقوں پر مشتمل تھی۔ اسماعیلی باطنی فرقہ بھی موجود تھا جس نے بحیرۂ قزوین (Caspian Sea) کے جنوب میں واقع علاقوں پر قبضہ کر رکھا تھا۔ سلجوقی سردار بحیرۂ قزوین کے اردگرد کے علاقوں، اناطولیہ اور اس سے متصل الجزیرہ اور شمالی شام کے کچھ علاقوں پر قابض تھے۔ کچھ ایوبی سردار شام کے شہروں اور قلعوں پر حکومت کر رہے تھے۔ ان سب کے ساتھ ساتھ بغداد میں عباسی خلافت بھی قائم تھی جسے بہت سی مذکورہ بالا حکومتوں پر علامتی اقتدار حاصل تھا۔ وہ انتہائی کمزور تھی اور اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہی تھی۔

اس کے علاوہ عالم اسلامی کے بہت سے شہروں میں باطنی مذاہب پھیلے ہوئے تھے۔ عراق، بحیرۂ قزوین کے جنوب کے اسماعیلی خطوں اور دوسرے بہت سے علاقوں میں پیش آنے والے واقعات انھی کے زیرِ اثر رونما ہوئے تھے۔

منگول جتھے اپنے اصلی وطن سطح مرتفع منگولیا اور وسط ایشیا کے ہمسایہ خطے سے نکلے۔ انھوں نے تندخو

عسکری لہروں کی شکل اختیار کر لی اور مغرب کی طرف چل پڑے۔ انھوں نے اپنے راستے میں آنے والے اسلامی ممالک میں زندگی کے ہر مظہر کو تباہ کر ڈالا۔ ان کی پہلی ٹکر ماوراء النہر کے علاقے میں خوارزم شاہی سلطنت سے ہوئی جس کا سربراہ علاء الدین خوارزم شاہ تھا۔ منگولوں کے اس سیلاب کے ساتھ ظلم و تشدد کا وہ ریلا تھا کہ ان علاقوں کے باشندوں نے ایسا وحشیانہ پن پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس وجہ سے عالم اسلام کے مختلف علاقوں میں لوگوں کے دلوں پر ان کا رعب پڑ گیا کیونکہ منگولوں نے بخارا، خجند، سمرقند، نسا، ترمذ اور بلخ وغیرہ کے شہروں میں بے دردی سے قتل عام کیا۔

ایک مؤرخ نے منگولوں کے ہاتھوں بخارا کی شکست کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: ''کافر شہر میں داخل ہو گئے، انھیں شہر میں جو بھی ملا، اسے لوٹ لیا اور قتل کر دیا۔ ..... انھوں نے مسلمانوں کو گھیر کر پکڑ لیا اور آپس میں تقسیم کر لیا۔ یہ بہت ہولناک منظر تھا۔ مرد، عورتیں اور بچے ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔ آہ و بکا کا شور برپا ہو گیا۔ انھوں نے عورتوں کو بھی تقسیم کر لیا۔ بخارا اس طرح ویران ہو گیا جیسے کبھی آباد ہی نہیں ہوا تھا۔ انھوں نے عورتوں پر ظلم کی حد کر دی۔ لوگ یہ حال دیکھ کر روتے تھے اور اس مصیبت کو ٹالنے کے لیے کچھ

بخارا کا مدرسہ

منگولیا کی سرحد پر کوہستان الطائی

نہیں کر سکتے تھے۔ بعض افراد نے اس ذلت کو برداشت نہ کرتے ہوئے موت کو ترجیح دی۔ وہ لڑے اور شہید ہو گئے۔ جس نے ہتھیار ڈال دیے، اسے گرفتار کر لیا گیا۔ انھوں نے مسجدوں اور مدرسوں کو آگ لگا دی اور لوگوں کو طرح طرح کی تکلیفیں دیں۔''[1]

دوسرے مؤرخین نے مسلمانوں پر آنے والی اس ذلت کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ منگول ایک کھلے میدان میں بہت سے افراد کو جمع کر لیتے تھے، پھر ان کی مُشکیں کَس دیتے، پھر ذبح کرنے والے انھیں بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کرتے چلے جاتے تھے جبکہ ذبح ہونے والوں کی طرف سے کوئی قابل ذکر مزاحمت نہیں کی گئی۔ انھوں نے مرو، ہرات اور دوسرے شہروں کو بھی اس طرح مقتل بنایا۔[2]

منگول حملے کے ابتدائی مراحل کے دوران میں علاء الدین خوارزم شاہ کے بعد اس کا بیٹا ''جلال الدین منکبرتی'' حکمران تھا۔ اس نے منگولوں کے مقابلے کے لیے بڑی تعداد میں فوج تیار کی۔ اس نے منگولوں سے کئی جنگیں کیں، بعض جنگوں میں اسے فتح بھی حاصل ہوئی لیکن ان معرکوں کا آخری نتیجہ یہ ہوا کہ خوارزم شاہی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا اور جلال الدین میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ جب منگولوں کی قوت اور وحشت کی خبریں اسلامی دنیا میں پھیلیں تو منگولوں کے قریبی علاقوں کی افواج بھی ان سے مرعوب ہو گئیں۔ ان میں سے کچھ نے اپنے مسلمان بھائیوں کی تباہی میں حصہ ڈال دیا، وہ اس طرح کہ انھوں نے منگولوں سے جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کرنے کی کوشش کی اور کچھ ان کے شر سے بچنے کے لیے اپنی کچھ افواج دوسرے مقامات پر جنگ میں ان کی مدد کے لیے بھیجنے لگے۔ عباسی سلطنت نے منگولوں کی پیش قدمی روکنے کے لیے بروقت اقدامات نہ کیے۔ بعد میں پیش آنے والے افسوس ناک واقعات میں اس تاخیر کا بھی بہت عمل دخل

---

[1] الكامل: 332/9. [2] العالم الإسلامي والغزو المغولي: 81.

تھا حتی کہ جب ہلاکو نے بغداد پر قبضہ کیا تو اس نے خلیفہ مستعصم کو یاد دلایا کہ اس مرحلے میں اس کے کیا فرائض تھے۔ خلیفہ کو گرفتار کرنے کے بعد جب اس نے خلیفہ کے خزانے میں بے شمار مال دیکھا تو سونے کا ایک تھال بھر کر اس کے سامنے رکھا اور اسے کھانے کا حکم دیا۔ مستعصم نے کہا: ''میں سونا کیسے کھا سکتا ہوں؟'' ہلاکو نے کہا: ''جب تجھے معلوم تھا کہ سونا کھایا نہیں جا سکتا تو پھر تو نے اسے کیوں نہ اپنی افواج میں تقسیم کر دیا تا کہ وہ ہمارے لشکر کے حملوں سے تیرے ملک کا دفاع کرتیں؟ تو نے ان لوہے کے پھاٹکوں سے تیر کیوں نہ بنا لیے کہ دریائے جیحون کے کنارے پہنچ کر ہمیں دریا پار کرنے سے روک لیتا؟'' خلیفہ نے کہا: ''تقدیر میں ایسے ہی لکھا تھا۔'' [1]

جب خلیفہ نے اپنی کمزوری اور فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کو تقدیر کی طرف منسوب کر دیا، تب یہ مصیبت ہی اس کے لیے اللہ کی تقدیر تھی۔ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللهِ.

---

[1] المغول في التاريخ: 267.

قدیم مرو (موجودہ ماری) میں قیز قلعہ، مرو ایک زمانے میں ترکمان سلجوقی سلطنت کا پایۂ تخت تھا

قدیم بغداد شہر کا نقشہ

سقوطِ بغداد اور خلافتِ عباسیہ کا خاتمہ

عراق تک پہنچنے سے پہلے منگول، عباسی خلافت کے تمام مشرقی صوبوں پر یکے بعد دیگرے قبضہ کر چکے تھے لیکن خلیفہ نے ان کا مقابلہ کرنے کے لیے کچھ نہ کیا۔ وہ بے فائدہ کاموں میں وقت ضائع کرتا رہا۔ وہ ملکی امور کی انجام دہی میں ایک رافضی وزیر ''مؤید الدین بن علقمی'' پر بھروسا کرتا تھا جو منگول لیڈر ہلاکو سے خفیہ طور پر رابطے میں تھا اور اس سے خط کتابت کرتا رہتا تھا۔ اس وزیر نے عباسی خلافت کے لشکر کو کمزور کرنے کے لیے اقدامات کیے۔ اس نے لشکر کی تعداد کم کر دی۔ غالباً یہ بھی ہلاکو سے ساز باز کا نتیجہ تھا۔ اس نے ہلاکو کی خوشامد کرتے ہوئے اسے کچھ مال بھی بھیجا۔

653ھ میں ہلاکو نے عباسی خلیفہ مستعصم کو خط لکھا اور اس سے مطالبہ کیا کہ قلعۂ الموت میں اسماعیلیوں کے خلاف جنگ میں مدد دینے کے لیے اپنی فوج بھیجے لیکن خلیفہ نے اس کا مطالبہ تسلیم نہ کیا۔ 655ھ میں ہلاکو خان نے عباسی خلیفہ کو ایک اور خط لکھا جس میں اسے ڈرایا دھمکایا اور مطالبہ کیا کہ خلافت پر اس کا ویسا ہی تسلط ہونا چاہیے، جیسا اس سے پہلے سلاجقہ وغیرہ کو حاصل تھا۔ خلیفہ نے اس کا مطالبہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اس کے دھمکی آمیز خط کے جواب میں ویسا ہی دھمکی آمیز خط لکھا۔ ہلاکو نے جواب میں پہلے سے سخت خط لکھا۔ خلیفہ نے اپنے وزیر ''ابن علقمی'' سے مشورہ کیا۔ اس نے مشورہ دیا کہ فوج کی تعداد کم کر

دی جائے اور اس طرح جو رقم بچے، وہ ہلاکو کو جزیہ کے طور پر ادا کر دی جائے۔ مؤرخین نے اس دور کا ایک اور واقعہ بیان کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ منگولوں کی تیاری اور عباسیوں کی تیاری میں کتنا فرق تھا۔ موصل کے گورنر ''بدرالدین لؤلؤ'' نے ہلاکو کے شر سے بچنے کے لیے اس کے ساتھ مضبوط تعلقات قائم کر لیے تھے جبکہ عباسی خلافت سے بھی اس کے تعلقات قائم تھے۔ اس کے پاس ہلاکو کے ایلچی اور خلیفہ کے ایلچی بیک وقت پہنچے۔ ہلاکو کے سفیروں نے بغداد پر حملہ کرنے کی تیاری کے لیے اسلحے اور منجنیقوں اور فصیلیں توڑنے کے لیے ضروری سامان کا مطالبہ کیا تھا جبکہ خلیفہ کے سفیر ایک مغنیہ کا مطالبہ لے کر آئے تھے جو موصل کے گورنر کے پاس تھی اور اس کی خوبصورت آواز کا شہرہ تھا۔ تب موصل کے گورنر نے کہا:

''ان دونوں ایلچیوں کو دیکھو اور اسلام اور مسلمانوں پر آنسو بہا لو۔''

بیت الحکمت (بغداد) جو کبھی سائنس، فنون اور یونانی علوم کا کتب خانہ تھا

منگول فوجیں بغداد پہنچ گئیں اور اسے مشرق اور مغرب کی طرف سے گھیر لیا۔ بغداد کا دفاع کرنے والی فوج کی تعداد دس ہزار بھی نہ تھی جبکہ اس شہر کی آبادی ایک ملین (دس لاکھ) نفوس سے زیادہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ دفاع کے لیے اس سے کہیں زیادہ افراد تیار کرنا ممکن تھا، بشرطیکہ حکام کی نظر میں اس کی کوئی اہمیت ہوتی۔ شہر کے باشندے بھی ایک حد تک اس صورت حال کے ذمہ دار تھے لیکن ان سب نے لاپروائی اختیار کی۔ ایک مؤرخ اس وقت دست یاب لشکر کی حالت بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: ''بغداد کی فوج انتہائی قلیل تعداد میں تھی، وہ بے حد کسمپرسی کی حالت میں تھی۔ ان کی تعداد دس ہزار سواروں تک بھی نہیں پہنچتی تھی۔ یہ بھی لشکر کا بچا کھچا حصہ تھا۔ ان سب کو جاگیروں سے بے دخل کر دیا گیا تھا حتی کہ بہت سے سپاہی مسجدوں کے دروازوں پر اور بازاروں میں بھیک مانگتے تھے۔ شعراء نے ان کی حالت زار پر نظمیں لکھیں جن میں اسلام

ہلاکو خلیفہ مستعصم باللہ کو اس کے خزانے کے ساتھ قید کرتا ہے (پندرہویں صدی عیسوی کی ایک تصویر)

اور مسلمانوں پر افسوس اور غم کا اظہار کیا۔ یہ سب کچھ رافضی وزیر ابن علقمی کے مشوروں کا نتیجہ تھا۔''[1]

لشکر میں موجود افراد کی ظاہری حالت تو اچھی تھی لیکن وہ ذہنی طور پر شکست خوردہ تھے۔ ایک مسلمان گھوڑ سوار بیان کرتا ہے کہ منگول سواروں اور مسلمان سواروں کے درمیان ظاہری طور پر کیا فرق تھا اور اس کا کیا نتیجہ تھا۔ وہ کہتا ہے: ''ہمارا سوار جب آگے بڑھ کر مبارزت (چیلنج) کرتا تو اس کے نیچے عربی گھوڑا ہوتا اور وہ مکمل ہتھیاروں سے لیس ہوتا۔ وہ ایک بڑا پہاڑ محسوس ہوتا۔ اس کے مقابلے میں منگول سوار نکلتا، اس کا گھوڑا ایسا ہوتا جیسے گدھا ہو اور اس کے ہاتھ میں ایسا نیزہ ہوتا جیسے سوت کاتنے کا تکلا ہو۔ اس نے نہ اچھا لباس پہن رکھا ہوتا، نہ عمدہ ہتھیار۔ جو دیکھتا اس کا مذاق اڑاتا لیکن دن ختم ہونے سے پہلے انھیں ہم پر فتح حاصل ہوگئی۔ انھوں نے ہمیں بری طرح شکست دے دی۔ اس سے مصیبت کے دروازے کھل گئے، پھر جو معاملہ ہوا، وہ محتاج بیان نہیں۔''[2] محاصرے کے دوران میں رافضی وزیر ''مؤید الدین بن علقمی'' اپنے بیٹوں، خادموں اور پیروکاروں کے ساتھ ہلاکو سے ملاقات کے لیے نکلا۔ وہاں اس کا بہت اعزاز و اکرام سے استقبال ہوا۔ ہلاکو کے بغداد پہنچنے سے پہلے بھی اس کا ہلاکو سے رابطہ تھا۔ ہلاکو کے حکم سے ابن علقمی بغداد

---

[1] البداية والنهاية: 13/200، 201. [2] ابن طباطبا کی الآداب السلطانية: 69، ابن طباطبا کا یہ بیان امام ابن کثیر رحمہ اللہ کے بیان سے بالکل متضاد ہے اور بظاہر امام ابن کثیر رحمہ اللہ کا بیان درست ہے۔ (مترجم)

آ گیا اور خلیفہ کو مشورہ دیا کہ غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیے جائیں۔ خلیفہ پیر کے 4 صفر 656ھ کو ہلاکو سے ملاقات کے لیے روانہ ہوگیا۔ اس کے ساتھ سات سو افراد تھے جن میں اس کے درباری، خادم، شاہی خاندان کے افراد، قاضی اور علماء شامل تھے۔ وہ جونہی ہلاکو کے کیمپ میں پہنچے، ان کی پے در پے توہین اور بے عزتی ہونے لگی۔ خلیفہ اور اس کے ساتھ سترہ اہم افراد کو ہلاکو سے ملاقات کے لیے منتخب کیا گیا۔ باقی سب کے سب تہ تیغ کر دیے گئے اور ان کا مال لوٹ لیا گیا۔[1]

اس کے بعد ہلاکو نے خلیفہ سے ملاقات کی اور اس سے مال و دولت اور خزانوں کے بارے میں دریافت کیا، پھر اس کے ساتھ وزیر ابن علقمی اور رافضی نصیر الدین طوسی کو بھیجا کہ وہ اس سے کچھ خزانہ قبضے میں لے کر محفوظ کر لیں۔ تب خلیفہ نے اپنے گھر میں سے بہت سا سونا اور جواہرات پیش کر دیے اور باقی چیزیں چھپا لیں۔ بعض کہتے ہیں کہ ہلاکو خود خلیفہ کے ساتھ اس کے گھر تک گیا اور کہا: ''تو میزبان ہے اور ہم مہمان ہیں۔''

خلیفہ خوف سے کانپ رہا تھا۔ اس کے خزانوں کے تالے توڑے گئے اور ہزاروں دینار اور نفیس ترین جواہر نکال لیے گئے۔ ہلاکو نے انھیں کوئی اہمیت نہ دی بلکہ اپنے ساتھیوں میں تقسیم کر دیے، پھر ہلاکو نے خلیفہ سے اصرار کیا کہ مدفون خزانوں کا پتا بتائے۔ خلیفہ نے شاہی محل کے درمیان ایک جگہ کھودنے کو کہا تو وہاں ایک حوض نکلا جو خالص سونے کے بڑے بڑے ٹکڑوں سے بھرا ہوا تھا۔ ہلاکو نے خلیفہ کو ملامت کرتے ہوئے کہا: تم نے یہ سارا سونا کس لیے سنبھال رکھا تھا؟ اسے فوج پر کیوں خرچ نہیں کیا؟

جب ہلاکو نے خلیفہ سے جو چاہا، لے لیا تو اسے بہت بری طرح قتل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اس کا یہ عقیدہ تھا کہ بادشاہوں کا خون اگر زمین پر گر جائے تو اس کا انتقام ضرور لیا جاتا ہے، اس لیے خلیفہ کو بوری میں بند

---

[1] البداية والنهاية: 203/13.

کر کے اس پر قالین ڈال دیے گئے (تاکہ مرنے پر اس کا خون زمین پر نہ گرے،) اور اسے پاؤں سے کچل کر مار دیا گیا۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ لوگ خلیفہ کے اوپر بیٹھ کر کھانا کھا رہے تھے اور ساتھ ساتھ اسے لاتیں مار رہے تھے حتی کہ وہ فوت ہو گیا۔ [1]

اس سے پہلے اور بعد میں بغداد کے مسلمانوں کو بلا امتیاز قتل کیا گیا۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''وہ شہر پر پِل پڑے اور جو مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے اور جوان قابو آئے، سب کو قتل کر دیا۔ بہت سے لوگ کنوؤں، ٹٹی خانوں اور گندے نالوں میں چھپ گئے اور کئی دن اسی طرح گزار دیے۔ بہت سے لوگ کسی سرائے میں داخل ہو کر دروازے بند کر لیتے تھے۔ تاتاریوں نے ان کے دروازے توڑ دیے یا جلا دیے اور اندر داخل ہو گئے۔ جو لوگ عمارتوں کے بالائی حصوں اور چھتوں کی طرف بھاگے تو انھیں چھتوں ہی پر قتل کر دیا گیا حتی کہ پرنالوں میں خون بہہ کر گلیوں میں گرنے لگا۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَ إِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ.

چھوٹی بڑی مسجدوں اور خانقاہوں میں بھی یہی حال ہوا۔ صرف ذمی اور عیسائی بچے یا وہ بچ سکے جنھوں نے ان کی پناہ حاصل کر لی یا جنھوں نے رافضی وزیر ''ابن علقمی'' کے گھر میں پناہ لے لی۔ کئی تاجروں نے بڑی بڑی رقمیں ادا کر کے ان سے پناہ حاصل کی تو ان کی جانیں اور مال محفوظ رہے۔'' [2]

منگولوں نے اہلِ بغداد کا قتل عام کیا حتی کہ ایک اندازے کے مطابق آٹھ لاکھ انسان موت کے گھاٹ اُتر گئے۔ قتل و غارت کا سلسلہ تقریباً چالیس دن تک جاری رہا۔ بغداد کی جامع مسجد میں اس قتل عام سے چونتیس دن بعد جو آخری خطبہ دیا گیا، اس میں خطیب نے کہا: ''تعریف اس اللہ کی ہے جس نے مضبوط عمارتیں بنانے والوں کو موت کے ذریعے سے منہدم کر دیا اور اس شہر والوں کے لیے فنا کا فیصلہ دے

---

[1] البداية والنهاية: 13/203. [2] البداية والنهاية: 13/202,201.

دیا..... یا اللہ! اس مصیبت میں ہمیں پناہ دے۔ ایسی مصیبت اسلام اور مسلمانوں پر کبھی نہیں آئی۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَ إِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ.

انھوں نے شہر کی مسجدوں اور مکانوں کو توڑ پھوڑ دیا اور ''شہر میں موجود علمی کتابیں جلا دی گئیں جن میں ایسے علوم وفنون تھے جو دنیا میں اور کہیں نہیں تھے۔ کہتے ہیں: انھوں نے ان کتابوں کو اینٹوں کی طرح گارے سے جوڑ کر ایک پل بنا لیا تھا۔''[1] یہ بھی کہا جاتا ہے کہ لوگ اتنی زیادہ تعداد میں قتل ہوئے کہ ہوا بدبودار ہوگئی حتی کہ بغداد میں موجود منگولوں کو، جن میں ہلاکو سرفہرست تھا، شہر سے نکلنا پڑا۔

ہلاکو خان بغداد کا محاصرہ کرتے ہوئے

ہلاکو نے خلیفہ کے سابق رافضی وزیر مؤید الدین بن علقمی کو بغداد میں اپنا نائب مقرر کیا۔ سقوطِ بغداد کا مسلمانوں اور غیر مسلموں، سب پر بہت اثر پڑا کیونکہ اس کے سقوط سے وہ اسلامی خلافت ختم ہوگئی جس کی نمائندگی عباسی کر رہے تھے جنھوں نے پانچ صدیوں سے زیادہ حکومت کی۔ اگرچہ اس دوران میں مسلمانوں کی کمزوری اور لاچاری کے وقفے بھی آتے رہے، اس کے باوجود خلافت کو مسلمانوں کا مذہبی نشان اور علامت سمجھا جاتا تھا۔ مسلمانوں کے اس کثرت سے قتل ہونے کا مختلف علاقوں کے مسلمانوں پر بھی اثر پڑا۔

---

[1] النجوم الزاهرة: 51/7.

اس کے علاوہ بغداد مسلسل پانچ صدیوں تک اسلامی دنیا کا مرکز رہا تھا جہاں ہر دور میں علماء، ادباء اور مفکرین موجود رہے۔

سقوط بغداد پر متعدد شعراء نے مرثیے لکھے جنھیں بلند پایہ شاعری تسلیم کیا گیا، مثلاً ایک شاعر نے کہا:

لِسَائِلِ الدَّمْعِ عَنْ بَغْدَادَ أَخْبَارٌ فَمَا وُقُوفُكَ وَالْأَحْبَابُ قَدْ سَارُوا؟

''بہتے ہوئے آنسو بغداد (پر گزرے ہوئے حوادث) کی خبریں سناتے ہیں۔ تو کیوں ٹھہرا ہوا ہے؟ احباب تو چلے گئے۔''

يَا زَائِرِينَ إِلَى الزَّوْرَاءِ لَا تَفَدُوا فَمَا بِذَاكَ الْحِمٰى وَالدَّارِ دَيَّارُ

''اے زوراء جانے والو! فدیہ پیش نہ کرو۔ اس وطن اور اس شہر میں اب کوئی نہیں رہتا۔''

تَاجُ الْخِلَافَةِ وَالرَّبْعُ الَّتِي شَرُفَتْ بِهِ الْمَعَالِمُ قَدْ عَفَاهُ إِقْفَارُ

''خلافت کا تاج اور وہ مقام جس سے ان نشانات کو شرف حاصل تھا، ویرانی نے سب کچھ مٹا دیا۔''

أَضْحٰى لِعَطْفِ الْبِلٰى فِي رَيْعِهِ أَثَرٌ وَلِلدُّمُوعِ عَلَى الْآثَارِ آثَارُ

''اس کی زمین پر بار بار ویران ہونے کے نشان ہیں اور ان نشانات پر آنسوؤں کے نشان ہیں۔''[1]

اس سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ یہ سب کچھ ایک بت پرست غیر مہذب قوم کے ہاتھوں ہوا جس نے کسی کے احترام کا خیال نہ کیا لیکن یہود و نصاریٰ کو کچھ نہ کہا۔

بغداد میں مسلمانوں پر آنے والی آفت سے دنیا کے مختلف علاقوں کے عیسائی بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے اسے مسلمانوں کے خلاف اپنی جنگ شمار کیا کیونکہ یہ حالات صلیبی جنگوں کے آخر میں پیش آئے۔ اس کے علاوہ منگولوں کے بعض خان اپنے گھروں میں عیسائی بیویاں رکھتے تھے، اس لیے عیسائیوں نے ان واقعات کو اپنے کارنامے شمار کیا اور اپنی منصوبہ بندیوں کا نتیجہ قرار دیا، خاص طور پر اس لیے بھی کہ ہلاکو کے دربار کے صلیبی بادشاہوں سے دوستانہ تعلقات تھے اور ایک دوسرے کی طرف ان کے سفیر آتے جاتے رہتے تھے۔

---

[1] النجوم الزاهرة: 50/7.

منگولوں کا شام پر حملہ

عراق سے فارغ ہو کر منگول شام اور الجزیرہ کی طرف چل پڑے۔ بغداد میں ان کی فتوحات اور خوں ریزی کی خبریں ان سے پہلے پہنچ چکی تھیں جس کی وجہ سے عوام اور سردار سب گھبرا گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے سرداروں نے منگولوں کی فوج پہنچنے سے پہلے ہی ان کے سفیروں ہی سے اطاعت قبول کرنے کا اظہار کر دیا۔ انھوں نے جو کچھ مانگا، انھیں مہیا کرنے کا وعدہ کر لیا حتی کہ بعض سرداروں نے اپنی کچھ مسلمان فوج بھی بھیج دی تا کہ وہ مسلمانوں کے دوسرے مقامات پر قبضہ کرنے میں حملہ آوروں کے ساتھ شریک ہو جائے۔ اس کے علاوہ شام اور آرمینیا میں عیسائیوں نے، بالخصوص آرمینیا کے بادشاہ ہیثوم نے منگولوں سے ہر طرح کا تعاون کیا اور شام کے بعض شہروں، مثلاً: حلب اور دمشق پر حملہ کرنے میں ان کے ساتھ شریک ہوا حتی کہ وہ فلسطین تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے اور پھر مصر کے قریب پہنچ گئے۔ [1]

---

[1] دیکھیے گزشتہ صفحات میں عنوان ''خاندانِ غلاماں کا صلیبیوں سے جہاد''۔

عینِ جالوت کا معرکہ

جب منگول فلسطین پہنچ گئے تو ان کا اگلا ہدف مصر تھا جو اسلامی دنیا کی پہلی جائے پناہ کی حیثیت رکھتا تھا اور اسے وہ قوت حاصل تھی جو منگولوں کا سامنا کر سکتی تھی اور ان کے کینے کی اس آگ کو بجھا سکتی تھی جس

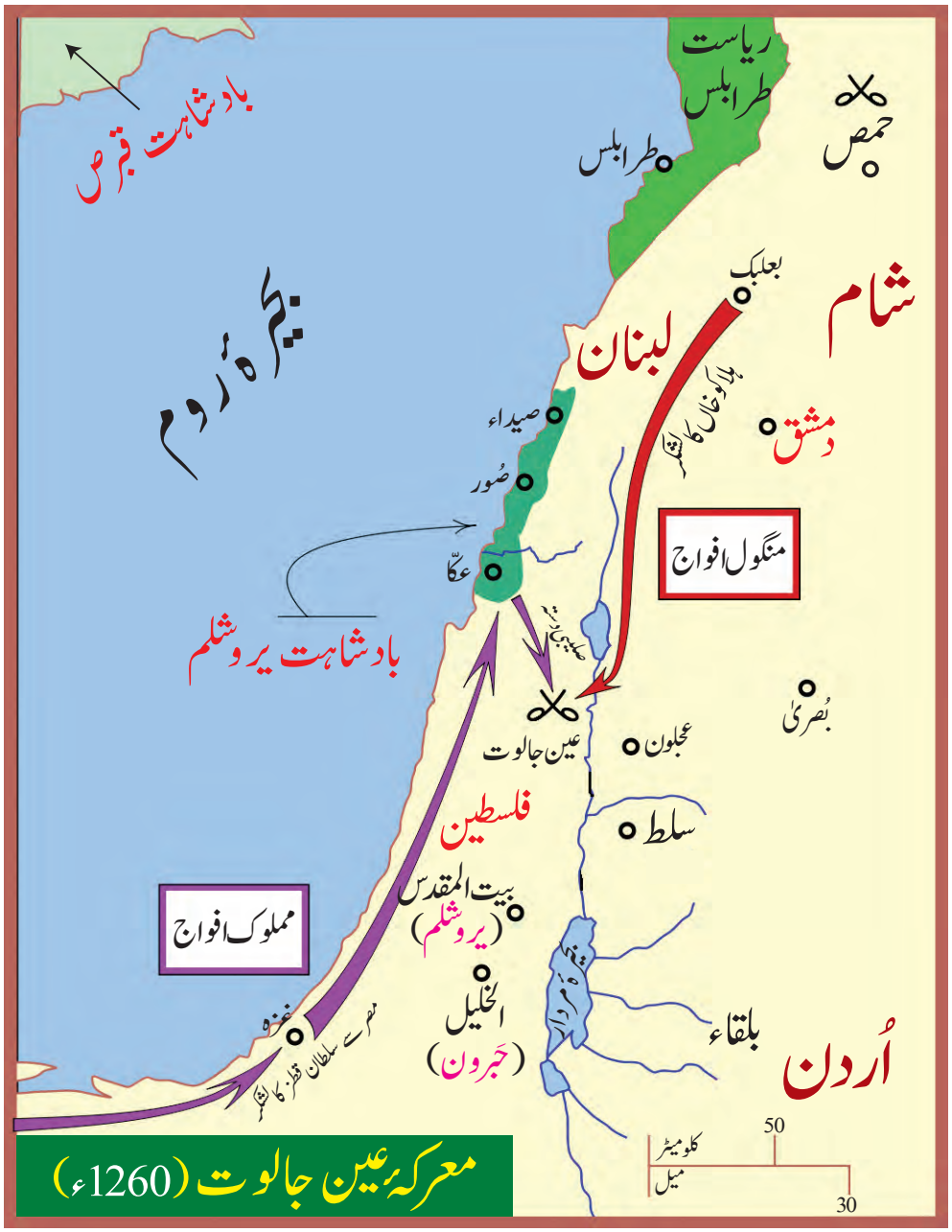

نے اسلامی دنیا کے مشرق کے علاوہ عراق اور شام کو جلا کر رکھ دیا تھا۔ منگولوں کا لیڈر ہلاکو[1] مصر پر قبضہ کرنے کے منصوبے بنا رہا تھا۔ اپنے کسی منصوبے کو عملی جامہ پہنانے سے پہلے اس نے مصر میں خاندانِ غلاماں کے سلطان ''سیف الدین قطز'' کے نام ایک دھمکی آمیز خط لکھا۔ اس خط کا کچھ حصہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔ اس نے لکھا: ''الملک المظفر قطز کو، اس کی سلطنت کے تمام سرداروں کو اور مصر میں اس کی مملکت کے تمام باشندوں کو اور اس کے اردگرد کے علاقوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہم روئے زمین پر خدائی لشکر ہیں، اس نے ہمیں اپنے غصے میں سے پیدا کیا ہے اور ہمیں ان لوگوں پر مسلط کیا ہے جن پر اس کا غضب نازل ہوا ہے۔ تمھارے لیے تمام ملکوں میں عبرت ہے (جن پر ہم نے قبضہ کیا ہے) اور ہمارا عزم تمھارے لیے ایک تنبیہ ہے، لہٰذا دوسروں کو دیکھ کر سمجھ جاؤ اور اپنی حکومت ہمارے حوالے کر دو۔ ورنہ جب پردہ اٹھے گا تو تمھیں ندامت ہوگی اور تمھیں اپنی غلطی کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ ہم کسی رونے والے پر ترس نہیں کھاتے اور کسی شکایت کرنے والے پر نرمی نہیں کرتے۔ تم نے سن لیا ہے کہ ہم نے بہت سے شہر فتح کر لیے ہیں، زمین کو فساد سے پاک کر دیا ہے اور اکثر بندوں کو قتل کر دیا ہے۔ اب تمھارا کام ہے بھاگنا اور ہمارا کام ہے تعاقب کرنا۔ اب کون سی زمین تمھیں پناہ دے گی؟ کون سا ملک تمھیں نجات دے گا؟ کون سا شہر تمھیں بچائے گا؟ ہماری تلواروں سے بچنا ممکن نہیں اور ہماری ہیبت سے چھوٹ جانے کی کوئی صورت نہیں۔ ہمارے گھوڑے سب سے آگے نکل جاتے ہیں، ہمارے تیر (جسموں میں) سوراخ کر دیتے ہیں، ہماری تعداد ریت کے ذروں کی طرح (بے شمار) ہے۔ ہمارے نزدیک (تمھارے) قلعے (تمھارے لیے) بے فائدہ ہیں۔ ہم سے لڑنے کے لیے لشکر بے کار ہیں، ہمارے خلاف تمھاری دعائیں قبول نہیں ہوتیں کیونکہ تم حرام کھاتے ہو۔ بات کرتے وقت گناہ سے نہیں بچتے ہو، عہد و پیمان میں خیانت کرتے ہو۔ تم میں نافرمانی اور عصیان عام ہے، اس لیے تمھیں ذلت کی خوشخبری ہے:

﴿فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَ بِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُوْنَ ۝﴾

''آج تمھاری جزا ذلت والا عذاب ہے کیونکہ تم زمین میں ناحق تکبر کرتے تھے اور تم فاسق تھے۔'' (الأحقاف 20:46)

---

[1] ہلاکو خان چنگیز خان کا پوتا اور تولی خان کا بیٹا تھا۔ چنگیز خان کی وفات (1227ء) پر تاتاری سلطنت تقسیم ہوئی تو ایران تولی کے بیٹوں کے حصے میں آیا اور انھوں نے یہاں ایل خانی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔

﴿وَ سَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ۝﴾

''ظالموں کو جلد معلوم ہو جائے گا کہ وہ کس رخ پلٹتے ہیں۔'' (الشعرآء 227:26)

جو ہم سے جنگ کرنا چاہتا ہے، (آخر کار) نادم ہوتا ہے اور جو ہماری امان حاصل کر لیتا ہے، سلامت رہتا ہے۔ اب اگر تم ہماری شرطیں اور ہمارے احکام مان لو تو جو ہمارے حقوق ہیں، وہی حقوق تمھارے بھی ہوں گے اور جو ہمارے فرائض ہیں، وہ تمھارے فرائض ہوں گے۔ اگر تم مخالفت کرو گے تو تباہ ہو جاؤ گے، اس لیے اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاک نہ کرو۔ جس نے (خطرناک چیز سے) خبردار کر دیا، اس کی طرف سے عذر ختم

منگولوں پر مملوک فوج کا دھاوا (وکی پیڈیا)

ہو گیا۔ تمھیں یقین ہے کہ ہم کافر ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ تم فاسق و فاجر ہو۔ تم پر ہمیں اس (اللہ) نے مسلط کیا ہے جس کے قبضے میں تمام معاملات اور طاقت ہے اور اس کے احکام تدبیر والے ہیں۔ تمھاری کثیر تعداد ہماری نظر میں قلیل ہے اور تمھارا معزز ہماری نظر میں ذلیل ہے۔ اور تمھارے بادشاہوں کے لیے ہمارے پاس اہانت کے سوا کچھ نہیں، لہٰذا بات لمبی نہ کرو اور جلد از جلد جواب دو۔'' [1] آخر تک خط کا یہی انداز تھا۔

---

[1] السلوك:1/427.

خاندانِ غلاماں کا بادشاہ ''سیف الدین قطز'' نیکی اور تقویٰ میں مشہور تھا۔ اکثر نمازیں باجماعت ادا کرتا تھا۔ شراب، لہو ولعب اور محرمات سے دور رہتا تھا۔ اسلام اور مسلمانوں سے مخلص تھا۔ لوگ اس سے محبت کرتے اور اسے دعائیں دیتے تھے، حالانکہ اس نے صرف چند مہینے حکومت کی تھی۔ [1]

سیف الدین قطز کو ہلاکو کا خط ملا تو اس نے علماء، کمانڈروں اور سرداروں کو جمع کیا اور اسے خط کا جواب دینے کے لیے ان سے مشورہ طلب کیا۔ انھوں نے اس بارے میں مختلف آراء کا اظہار کیا۔ کچھ بزدل تھے۔ انھوں نے قطز کو منگولوں اور ان کے سردار ہلاکو کی اطاعت قبول کرنے کا مشورہ دیا۔ انھوں نے کہا: ان لوگوں سے جنگ کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ اس سے پہلے وہ ہر کسی پر فتح یاب ہوئے ہیں۔ اسی طرح وہ ہم پر بھی فتح پا لیں گے۔ ان بزدلوں نے قطز کو خوف زدہ کرنے کی کوشش کی۔ اسے شام اور عراق وغیرہ میں منگولوں کے وحشیانہ پن کے حالات سنا کر ان کے دبدبے سے ڈرانے کی کوشش کی۔ بعض نے یمن یا مغرب کی طرف بھاگ جانے کی تجویز پیش کی لیکن قطز کی رائے دانش مندانہ اور دوٹوک تھی کہ وہ ان حملہ آوروں سے جنگ کرے گا جنھوں نے قتل و غارت کی، فساد پھیلایا اور عزتیں پامال کیں، اس لیے جو سردار اور کمانڈر جنگ نہ کرنے کی رائے رکھتے تھے، ان کے جواب میں اس نے کہا: ''اے مسلمانوں کے امیرو! تم ایک عرصے سے بیت المال کا مال کھا رہے ہو اور تم جنگ نہیں کرنا چاہتے۔ میں (جنگ کے لیے) روانہ ہو رہا ہوں۔ جو شخص جہاد کرنے کا فیصلہ کرتا ہے، وہ میرے ساتھ آجائے اور جس کا یہ فیصلہ نہیں، وہ اپنے گھر چلا جائے۔ اللہ اسے دیکھ رہا ہے اور مسلمانوں کی عزتوں کی پامالی کا گناہ پیچھے رہنے والوں کے سر ہوگا۔'' [2]

اس کے بعد قطز نے ایک عملی قدم اٹھایا جس نے منگولوں سے مذاکرات کا دروازہ بند کر دیا۔ اس نے حکم دیا کہ ہلاکو کے ایلچیوں کو قتل کر دیا جائے اور ان کی لاشیں قاہرہ کے دروازوں پر لٹکا دی جائیں۔ قطز کا منگولوں سے لڑائی کے لیے خود روانہ ہونا اس بات کی دلیل تھا کہ وہ دل سے جہاد کا عزم کیے ہوئے ہے۔ قاہرہ میں اور مصر کے دوسرے صوبوں میں جہاد کے لیے روانگی کا اعلان کر دیا گیا۔ [3]

قطز نے مختلف کاموں کے انتظامات کرنے شروع کر دیے۔ فوج کو جنگ کی تیاری کے لیے بہت زیادہ رقم کی ضرورت تھی، چنانچہ قطز نے سوچا کہ جہاد کی تیاری کے لیے لوگوں پر کچھ ٹیکس لگا دیے جائیں لیکن اس نے خود ہی یہ فیصلہ کر کے عوام پر نافذ کرنے کے بجائے اس مسئلے پر غور کرنے کے لیے علماء اور

---

[1] البداية والنهاية: 225/13. [2] البداية والنهاية: 220/13. [3] السلوك: 429/1.

کمانڈروں کا اجلاس بلا لیا۔ قاضی اور کمانڈر حضرات تو عوام پر ٹیکس لگانے کے حق میں تھے لیکن اس نے سلطان العلماء الشیخ عز بن عبدالسلام کی حق پر مبنی بات سنی۔ انھوں نے فرمایا تھا: ''ضروری ہے کہ آپ خود، تمام سردار اور خاندان کے دیگر افراد وہ تمام سونا وغیرہ جمع کریں جو آپ لوگوں کی ملکیت ہے۔ اگر یہ اموال کافی نہ ہوں تو ہم عوام کو مالی جہاد کی دعوت دیں گے لیکن یہ درست نہیں کہ لوگ تو مال پیش کریں اور تم سونے چاندی کا خزانہ محفوظ رکھو۔ آپ کا خود اعلیٰ مثال پیش کرنا ضروری ہے۔'' [1]

سلطان پر شیخ عز بن عبدالسلام کی نصیحت کا بہت اثر ہوا۔ اس نے منگولوں سے جنگ کے لیے عوام سے مالی تعاون طلب کرنے سے پہلے اپنے مال اور خزانے باہر نکال دیے۔ بہت سے سرداروں نے بھی اس کی اقتدا کرتے ہوئے فوراً اپنے جمع کیے ہوئے مال پیش کر دیے۔

قطز کا پروگرام یہ تھا کہ منگولوں کے مصر تک پہنچنے سے پہلے خود آگے بڑھ کر ان پر اچانک حملہ کر دیا جائے۔ اس مقصد کے لیے مصر کی اسلامی فوج کو ساحل کے قریب بعض صلیبی علاقوں سے گزرنا پڑتا تھا جو مسلمانوں کے ساتھ حالتِ جنگ میں تھے اور منگولوں سے ان کی صلح تھی، چنانچہ ان سے خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔ قطز نے فوراً ان سے رابطہ کیا اور ان سے مطالبہ کیا کہ وہ مسلمانوں اور منگولوں کی جنگ میں غیر جانبدار رہیں اور مسلمانوں کو اپنے علاقے سے گزر جانے دیں۔ اس نے انھیں دھمکی دی کہ اگر یہ مطالبہ تسلیم نہ کیا گیا تو مسلمانوں کی فوج کا رُخ ان کی طرف ہو جائے گا۔ صلیبیوں نے محسوس کیا کہ قطز واقعی سنجیدہ ہیں تو انھوں نے غیر جانبدار رہنے پر اتفاق کر لیا۔ [2]

مسلمانوں کی مصری فوج پوری طرح تیاری کے بعد غزہ کے قریب جمع ہوئی۔ وہ میدانِ جنگ تک پہنچنے کے لیے ساحل کے ساتھ ساتھ بعض صلیبی علاقوں سے گزرے جو دفاع کرنے والوں سے خالی تھے۔ بعض کمانڈروں نے قطز کو مشورہ دیا کہ صلیبی مراکز پر قبضہ کر لیا جائے کیونکہ اس وقت

---

[1] النجوم الزاهرة: 73,72/7. [2] السلوك: 430/1.

ان کا دفاع کرنے والا کوئی موجود نہیں۔ قطز نے انھیں ڈانٹ دیا اور انھیں یاد دلایا کہ اسلام کی ہدایات یہ ہیں کہ حالات جیسے بھی ہوں، وعدہ پورا کیا جائے اور مسلمان دشمنوں کے حالات سے فائدہ اٹھا کر عہد شکنی نہیں کرتے۔ آپ نے اس پہلو سے مسلمانوں کے اخلاق کی ایک مثال قائم کر دی۔

مسلمان ''عین جالوت'' کے علاقے میں پہنچ گئے۔ بعض سردار اب بھی منگولوں سے جنگ کے بارے میں متردد تھے۔ قطز نے فرمایا: ''تاتاریوں کا سامنا میں خود کروں گا۔'' تب خاندان کے سرداروں اور دیگر افواج کی ہمت بندھی۔ قطز نے فوج کا ایک دستہ ''رکن الدین بیبرس'' کی قیادت میں بھیجا کہ وہ فوج سے آگے جا کر دشمن کے بارے میں معلومات حاصل کرے۔ اس دستے کو عین جالوت کے قریب تاتاری نظر آئے۔ بیبرس سے ان کی جھڑپ ہوگئی۔ اس نے قاصد بھیج کر سلطان قطز اور مسلمانوں کو حالات کی اطلاع دی۔ قطز اور اس کے ساتھی آگے بڑھ کر عین جالوت کے مقام پر پہنچ گئے۔ اس وقت منگول فوجیں بھی ہلاکو کے نائب کتبغا کی قیادت میں وہاں پہنچ گئیں۔ ہلاکو اپنے ملک کے مشرقی علاقوں کے بعض حالات کی وجہ سے شام سے چلا گیا تھا۔

عین جالوت کے مقام پر بروز جمعہ پندرہ رمضان 658ھ کو منگولوں سے جنگ ہوئی۔ منگولوں نے اب تک جو (وحشیانہ) کام کیے تھے، ان کی وجہ سے مسلمان ان سے خوف محسوس کر رہے تھے اور اس لیے بھی کہ منگولوں نے اب تک کسی سے شکست نہیں کھائی تھی لیکن مسلمانوں کی صفوں میں قطز کی بذاتِ خود موجودگی سے مجاہدین کو ثابت قدم رہنے میں مدد ملی۔ اس نے ان کی حوصلہ افزائی کی، جنگ کرنے اور شہادت کی تلاش کرنے کی ترغیب دی۔ اس کے علاوہ وہ اس کے صدق اور اخلاص سے واقف تھے، اس لیے مجاہدین ڈٹ گئے۔ جنگ شروع کرنے سے پہلے قطز نے کہا کہ تھوڑا سا ٹھہر کر لڑائی شروع کی جائے۔ اس کا مقصد یہ تھا جیسے اس نے خود کہا: ''حتی کہ سورج ڈھل جائے، ہوا چلے اور نماز میں خطیب اور عام مسلمان ہمارے حق میں دعا کریں۔'' [1]

سلطان قطز نے رسول اللہ ﷺ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی اتباع میں یہ وقت منتخب کیا کیونکہ یہ حضرات سورج ڈھلنے کے بعد جنگ شروع کرنا پسند کرتے تھے۔ مسلمانوں کے لیے یہ جنگ بہت سخت تھی۔ قریب تھا کہ دشمن انھیں اپنی جگہ چھوڑنے پر مجبور کر دے۔ سلطان قطز اپنی فوج کو ثابت قدمی کی مسلسل تلقین کر رہے تھے، انھیں فوج کے جس حصے میں کمزوری کے آثار نظر آتے، فوراً ادھر تشریف لے جاتے۔ ان کے عزم کو مضبوط کرتے اور ان کی حوصلہ افزائی فرماتے۔ معرکے کے دوران میں کئی مواقع پر ان کا دلیرانہ

---

[1] البداية والنهاية: 226/13.

معرکہ عین جالوت میں مصری مملوک مجاہد اور منگول سپاہی میں لڑائی کا منظر

کردار سامنے آیا۔ ایک واقعہ یوں ہے کہ ''سلطان کا گھوڑا ہلاک ہوگیا۔ اس نازک وقت میں اس کے قریب اس خاص دستے میں سے کوئی موجود نہ تھا جن کے پاس گھوڑے (تیار) ہوتے تھے، چنانچہ وہ پیدل ہوگیا۔ وہ زمین پر ثابت قدمی سے کھڑا رہا جبکہ لڑائی پورے زوروں پر تھی اور وہ لشکر کے قلب میں بادشاہ کے مقام پر تھا۔ ایک سردار نے انھیں اس حال میں دیکھا تو اپنے گھوڑے سے اتر آیا اور سلطان کو قسم دے کر کہا کہ وہ اس پر سوار ہو جائے لیکن قطز نے انکار کر دیا اور اس سردار سے کہا: ''میں مسلمانوں کو تمھاری افادیت سے محروم نہیں کرنا چاہتا۔''

جب خاص دستے کے افراد گھوڑے لے کر حاضر ہوئے، تب وہ سوار ہوئے۔ بعد میں ایک سردار نے انھیں ملامت کرتے ہوئے کہا: ''جناب عالی! آپ فلاں کے گھوڑے پر کیوں سوار نہ ہوئے؟ اگر کوئی دشمن آپ کو دیکھ لیتا تو شہید کر دیتا اور آپ کی وجہ سے اسلام کا نقصان ہو جاتا۔'' سلطان نے کہا: ''جہاں تک میرا معاملہ ہے تو (اگر ایسا کچھ ہو جاتا تو) میں جنت میں چلا جاتا۔ اور رہا اسلام تو اس کا ایک رب ہے، وہ اسے ختم نہیں ہونے دے گا۔'' انھوں نے کئی بادشاہوں کا نام لے کر کہا: ''فلاں، فلاں اور فلاں شہید ہو گئے تو اللہ نے اسلام کی حفاظت کے لیے اور لوگ کھڑے کر دیے۔ اور اسلام اب بھی قائم ہے۔''[1]

قطز خود بھی بڑی جرأت اور بے مثال بہادری سے جنگ کرتے تھے۔ وہ مسلسل بڑی عاجزی کے ساتھ اللہ سے دعا کرتے رہتے تھے۔ کسی نے سنا، وہ کہہ رہے تھے: ''یااللہ! اپنے بندے قطز کی مدد فرما۔'' تاتاریوں نے مسلمانوں کی فوج کے میسرہ پر زور دار حملہ کیا۔ فوج کے قدم اکھڑنے لگے تو قطز اور اس کے

---

[1] البداية والنهاية: 13/2225.

بعض سرداروں نے انھیں سہارا دیا حتی کہ وہ قائم ہوگئے۔ اس معرکے میں ان کا یہ آواز دینا ہی مشہور واقعہ ہے کہ انھوں نے پکارا: ''ہائے اسلام! ہائے اسلام!'' [1]

الغرض شدید جنگ ہوئی۔ آخر مسلمانوں کو فتح ہوئی۔ منگول سالار ''کتبغا'' جنگ میں قتل ہوگیا۔ اس کا بیٹا گرفتار ہوا۔ منگول لشکر نے شکست کھائی۔ ان میں سے تھوڑے سے افراد ہی بھاگ کر بچ سکے۔ جب منگول لشکر میں شکست کے آثار نمایاں ہوگئے تو سلطان گھوڑے سے اتر آیا۔ اس نے اللہ کے سامنے عجز و نیاز کا اظہار کرتے ہوئے اپنا چہرہ زمین پر رکھ دیا۔ اس نے مومنوں کی مدد پر اللہ کا شکر کرتے ہوئے میدانِ جنگ میں دو رکعت نماز ادا کی۔ شام کے بعض سردار منگولوں سے جا ملے تھے۔ وہ اسلامی فوج کے ہاتھوں گرفتار ہوئے تو ان کی گردنیں اڑانے کا حکم دے دیا۔ ان کی خیانت کی سزا دیتے ہوئے اس نے کسی کی سفارش قبول نہ کی۔ علاوہ ازیں شام اور اس کے قرب و جوار سے پکڑے گئے منگول اور ان کے حامی سردار، فوجی اور ان سے فائدے حاصل کرنے والے افراد مارے گئے۔ ان میں ایک رافضی شیخ بھی تھا جو لوگوں کے مال چھیننے میں تاتاریوں کا مددگار تھا۔ [2]

مسلمان دوبارہ اپنی سرزمین پر اپنا اقتدار قائم کرنے اور ان نصاریٰ کا قلع قمع کرنے میں کامیاب ہوگئے جو دمشق وغیرہ میں منگولوں کی حمایت سے مسلمانوں پر ظلم کرتے تھے۔ [3]

سیف الدین قطز نے منگولوں پر فتح پانے کے بعد شام کا نظم ونسق درست کیا۔ وہاں فوج رکھی۔ عدل و انصاف اور امن و امان قائم کیا۔ اس جنگ کے نتیجے میں مصر اور شام دوبارہ متحد ہوگئے۔ منگولوں کے کاسہ لیس اور علیحدگی پسند سردار شکست کھا گئے جو مسلمانوں کے اجتماعی مفاد کو نظرانداز کر کے اپنے ذاتی فوائد حاصل کرتے تھے۔ اس جنگ کے بعد مصر کو اسلامی دنیا کے واقعات میں مرکزی حیثیت حاصل ہوگئی۔ کسی اور شہر کا مقام اس کے برابر نہ رہا۔ علاوہ ازیں مسلمانوں کے بارے میں منگولوں کا زاویہ نظر تبدیل ہوگیا۔ ان کے سردار مسلمانوں سے ٹکر لینے کے بجائے ان سے اچھے تعلقات قائم کرنے اور انھیں خوش کرنے کی کوشش کرنے لگے۔

عین جالوت کے معرکے سے دو ماہ بعد سیف الدین قطز ایک پراسرار حادثے میں شہید ہوگئے۔ ان کے بعد ملک کی باگ ڈور ''رکن الدین الظاہر بیبرس'' نے سنبھالی۔ اس کی حکومت کے ابتدائی ایام میں منگولوں نے اپنے سردار ہلاکو کی قیادت میں شام پر ایک بار پھر حملہ کرنے کی کوشش کی لیکن بادشاہ ''رکن الدین الظاہر بیبرس'' نے ان کا حملہ روکا اور انھیں شکست دے دی، چنانچہ وہ ناکام ہوکر واپس چلے گئے۔ [4]

---

[1] السلوك:1/431. [2] البداية والنهاية:13/221. [3] السلوك:1/432. [4] البداية والنهاية:13/223.

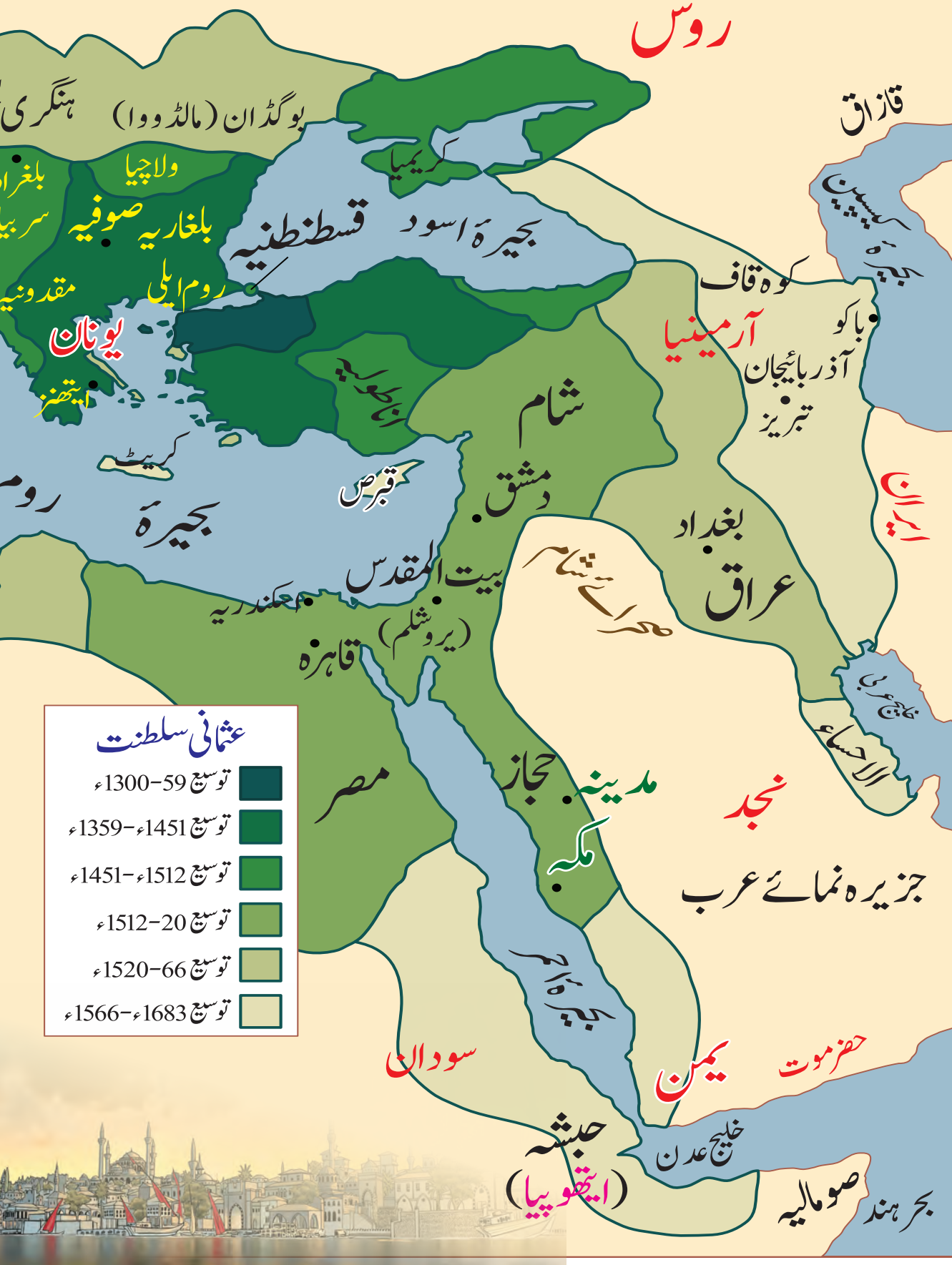

روس
قازاق
ہنگری
بوگڈان (مالڈووا)
ولاچیا
بلغراد
سربیا
بلغاریہ
صوفیہ
قسطنطنیہ
بحیرۂ اسود
کریمیا
روم ایلی
مقدونیہ
یونان
ایتھنز
کریٹ
روم
بحیرۂ
قبرص
اناطولیہ
شام
دمشق
بیت المقدس
(یروشلم)
اسکندریہ
قاہرہ
مصر
حجاز
مدینہ
مکہ
نجد
جزیرہ نمائے عرب
صحرائے شام
بغداد
عراق
کوہ قاف
آرمینیا
باکو
آذربائیجان
تبریز
ایران
بحیرۂ کیسپین
خلیج عرب
الاحساء
بحیرۂ احمر
سوڈان
یمن
حضرموت
حبشہ
(ایتھوپیا)
خلیج عدن
صومالیہ
بحر ہند
عثمانی سلطنت
توسیع 1300-59ء
توسیع 1359ء-1451ء
توسیع 1451ء-1512ء
توسیع 1512-20ء
توسیع 1520-66ء
توسیع 1566ء-1683ء

حصہ 7

عثمانی سلطنت

سقوطِ اندلس۔غرناطہ پر دشمنوں کا قبضہ (897ھ/ 1492ء)

اندلس جب سے مسلمانوں کے زیرنگیں آیا تھا، تبھی سے یہ ملک علم کا مینار، توحید کا مرکز اور اسلام کا قلعہ بنا ہوا تھا۔ اس کا یہ مقام کئی صدیوں تک قائم رہا۔ اس دوران میں اس پر مختلف نسلوں اور قبیلوں کے حکمران اور کمانڈر حکومت کرتے رہے۔ یہ کبھی ایک طاقتور سلطنت رہی، کبھی ایک کمزور ریاست۔ اس کی قوت کے دور کی سب سے نمایاں مثال عبدالرحمٰن الناصر کا دورِحکومت ہے اور کمزوری کے زمانے کی واضح ترین مثال جنگ زلاقہ (479ھ) سے قبل کا طوائف الملوکی کا پہلا دور اور اس سے متصل زمانہ ہے، بالخصوص جب اس کے بہت سے حصے بخرے ہوگئے اور بعض مسلمان قائدین نے اپنے مسلمان بھائیوں کے خلاف عیسائی سرداروں سے معاہدے کر لیے، چنانچہ اندلس میں مسلمانوں کی طاقت آہستہ آہستہ کم ہوتی چلی گئی۔ اس کے شہروں اور قلعوں پر یکے بعد دیگرے عیسائیوں کا قبضہ ہوتا چلا گیا۔ نویں صدی ہجری کے آخر میں مسلمانوں کے پاس صرف غرناطہ کی مملکت رہ گئی جس کے چند ایک شہر اور محدود سرحدیں تھیں یا مشہور قصر الحمراء رہ گیا جو پہاڑیوں پر سے اپنے قطعاتِ ارضی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے حکمران عیش وعشرت، عمارتیں بنانے، کھانے پینے اور گانے بجانے میں مشغول تھے۔ انھیں سامانِ جنگ تیار کرنے، جہادی قوت کے حصول اور اس کی تیاری کی کوئی فکر نہ تھی۔

غرناطہ کے مسلمانوں سے چھن جانے سے پہلے اس پر خاندانِ بنی احمر نے تقریباً ڈھائی سو سال حکومت کی تھی۔ اس دوران میں کئی بار طویل مدت تک انھیں اندلس کے عیسائی بادشاہوں کا غلبہ قبول کرنا پڑا اور انھیں ٹیکس دینا پڑا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ اندلس کے شہر ایک ایک کر کے دشمن کے قبضے میں جا رہے ہیں۔ اس کے باوجود انھیں ہوش نہ آیا اور انھوں نے اپنی طرف بڑھتے ہوئے خطرے کو محسوس نہ کیا۔

بنی احمر کے بادشاہ نہ صرف قشتالہ کے بادشاہوں کو ٹیکس دیتے تھے بلکہ وہ مملکت غرناطہ میں مسلمانوں کے قلعوں اور شہروں سے قشتالہ کے حق میں دست بردار ہو جاتے تھے، چنانچہ وہ آہستہ آہستہ کمزور ہوتے گئے، ان کی مملکت کا رقبہ کم ہوتا گیا اور اس کا دبدبہ مضمحل ہوتا گیا۔ مقّری تلمسانی لکھتا ہے: ''وہ جزیرہ نما اندلس کے گھروں کو ویران کرنے اور اس کے شہروں اور علاقوں پر قبضہ کرنے میں اسی وقت کامیاب ہو سکے جب انھوں نے (مسلمانوں میں) اختلاف کے اسباب پختہ کر دیے اور مسلمانوں میں پوری جدوجہد سے افتراق اور اختلاف پیدا کر دیا اور مکر وفریب سے کام لے کر اندلس کے حکمرانوں کو ایک دوسرے سے لڑا دیا اور اس کے محافظوں کو ریشہ دوانیوں سے کام لے کر ایک دوسرے کے خلاف بھڑکا دیا اور تباہ کن فتنوں میں مبتلا کر دیا۔ اگرچہ ان کی بات ایک تھی، آراء میں اختلاف و افتراق نہ تھا۔ علماء اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لیے دلوں کو جوڑنے کی کوشش کر رہے تھے، تاہم جنگ کی کیفیت ہر وقت بدلتی رہتی تھی۔ اللہ کے کچھ بندے جہاد کے لیے کھڑے تھے اور دفاع کی غرض سے (دشمن کے کاموں میں) رکاوٹ ڈالنے کے لیے میدان وسیع تھا اور غور وفکر کرنے یا فوری فیصلہ کرنے کی گنجائش موجود تھی۔'' [1]

---

[1] نفح الطیب: 508/1.

اس سے خطرناک معاملہ یہ تھا کہ بعض اوقات ان سے یہ شرط منوا لی جاتی تھی کہ وہ سپین کے دوسرے حصوں میں اپنے مسلمان بھائیوں کے خلاف جنگ میں عیسائیوں کی مدد کریں گے، مثلاً 646ھ میں فرنانڈو سوم نے اشبیلیہ پر ابن احمر کی مدد سے قبضہ کیا تھا۔ اسی دوران میں دوسرے مقامی سردار بھی اپنے مسلمان بھائیوں کے مقابلے میں عیسائیوں کا ساتھ دے رہے تھے۔ مقّری تلمسانی کہتا ہے: ''جب اندلس کے بڑے بڑے شہر، مثلاً: قرطبہ، اشبیلیہ، طلیطلہ اور مُرسیہ وغیرہ دشمن کے قبضے میں چلے گئے تو مسلمان غرناطہ، المیریہ، مالقہ وغیرہ میں سمٹ آئے اور یہ وسیع مملکت تنگ ہوگئی۔ دشمن اژدہا ہر وقت کسی نہ کسی شہر یا قلعے کو ہڑپ کرتا رہتا تھا اور اس شجرِ مملکت کی ایک ایک شاخ کو توڑتا رہتا تھا۔ ملک کے بچے کھچے چھوٹے سے ٹکڑے پر بنی احمر کے بادشاہ حکومت کر رہے تھے۔'' [1]

اگرچہ غرناطہ کے مسلمانوں کو صورتِ حال کی نزاکت کا احساس تھا لیکن انھوں نے اس کا مقابلہ کرنے کے لیے مناسب اور کافی اقدامات نہیں کیے۔

سقوطِ غرناطہ سے پہلے برسوں میں اراگون (ارغون) اور قشتالہ کی (عیسائی) ریاستوں نے اتحاد کر لیا۔ اراگون کے بادشاہ فرنانڈو نے قشتالہ کی ملکہ ازابیلا سے شادی کر لی تھی۔ اس وجہ سے اندلس کے عیسائیوں کی قوت میں اضافہ ہوگیا۔ ان دونوں کی سلطنتیں مل کر ایک ہوگئیں۔ ان دونوں کی افواج باہم تعاون سے مضبوط ہوگئیں جبکہ انھی ایام میں اندلس کے باقی ماندہ مسلمانوں میں اختلاف بڑھ گیا بلکہ مسلمانوں کے اس آخری قلعے کے سرداروں میں پھوٹ پڑ گئی۔ غرناطہ کے زیرِ انتظام علاقے دو حصوں میں تقسیم ہوگئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ غرناطہ کے آخری امیر ابوعبداللہ محمد النصری کا اپنے چچا محمد سے جو الزغل کے نام سے مشہور تھا، اختلاف ہوگیا تھا۔

اسی اختلاف کا نتیجہ تھا کہ فرنانڈو (فرڈی ننڈ) اور ازابیلا نے دوسروں سے مدد لیے بغیر وادی آش، المیریہ کی ریاست اور اس سے متصل علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ اس دوران میں نہ غرناطہ کے باشندوں نے اپنے بھائیوں کی مدد کی، نہ وہاں کے امیر ''ابوعبداللہ بن ابوالحسن نصری'' نے اپنے چچا کا ساتھ دیا۔

اندلس کے عیسائیوں نے غرناطہ کے سرحدی علاقے چھین لیے اور ان کے زیرِ انتظام مقامات پر قبضہ کر لیا۔ انھوں نے وہاں کے باشندوں پر سختی کی اور ضروریاتِ زندگی ان تک پہنچنے سے روک دیں، چنانچہ عوام سرحدی علاقوں سے بھاگ بھاگ کر غرناطہ میں جمع ہونے لگے۔ اس وجہ سے وہاں لوگوں کی تعداد زیادہ ہونے سے غذائی قلت پیدا ہوگئی۔ [2]

---

[1] نفح الطیب: 438/1. [2] نفح الطیب: 435/1.

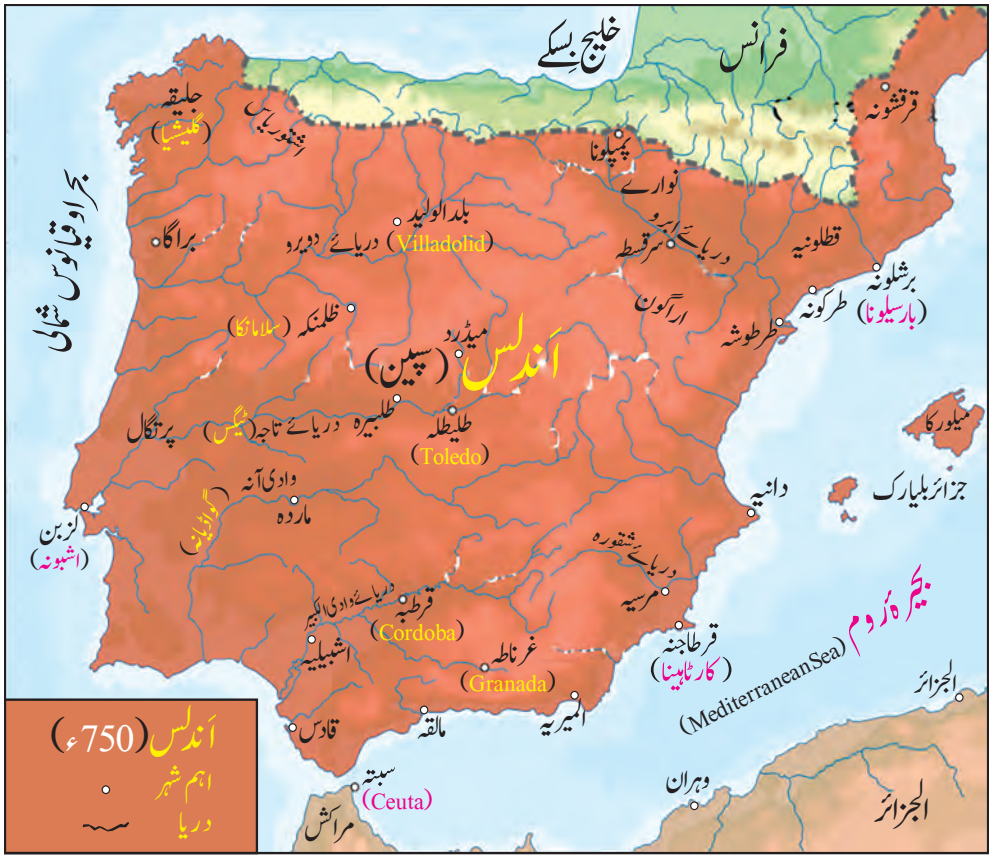

محرم 897ھ میں اندلس کے عیسائیوں نے قشتالہ کے بادشاہ فرناندو اور ملکہ ازابیلا کی زیر قیادت غرناطہ کا محاصرہ کرلیا جو اندلس میں مسلمانوں کا آخری قلعہ تھا۔ اس کی حکومت ابوعبداللہ کے ہاتھ میں تھی جس نے دشمن کا اس طرح سامنا کرنے کی تیاری نہیں کی تھی جس طرح دفاع کرنے والے جنگجو کیا کرتے ہیں۔

اندلس کے بعض مجاہدین نے، جن میں سب سے نمایاں شخصیت ''موسیٰ بن ابی غسان'' کی تھی، کوشش کی کہ قوم کو ہتھیار ڈالنے سے باز رکھیں اور انھیں خبردار کریں کہ ہتھیار ڈالنے کی صورت میں قشتالہ کے عیسائی کسی عہد و پیمان کا لحاظ نہیں رکھیں گے۔ [1]

آخر کار مسلمانوں کی آخری جائے پناہ، یعنی غرناطہ نے 2 ربیع الاول 897ھ مطابق 2 جنوری 1492ء کو کیتھولک مملکت کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ [2]

---

[1] مواقف حاسمة في تاريخ الإسلام: 313. [2] جی سی کولن کی الأندلس: 139.

سپین میں اشبیلیہ (سویلاً) کا ہسپانیہ چوک

شہر سے دست برداری اور صلح کے موقع پر ایک طویل معاہدہ لکھا گیا جو 76 شرطوں پر مشتمل تھا۔ اس میں صراحت سے یہ الفاظ لکھے گئے: ''ہر چھوٹے بڑے کی جان اور گھر بار محفوظ ہوگا۔ لوگوں کو ان کے گھروں، زمینوں اور جاگیروں سے بے دخل نہیں کیا جائے گا۔ ان کے مذہبی معاملات حسب سابق رہیں گے۔ ان کے فیصلے ان کی شریعت کے مطابق کیے جائیں گے۔ مسجدیں اور اوقاف اپنی حالت پر قائم رکھے جائیں گے، عیسائی کسی مسلمان کے گھر میں داخل نہیں ہوں گے اور اسے اغوا نہیں کریں گے۔ مسلمانوں پر وہ مسلمان یا یہودی افسر مقرر ہوں گے جو ان کے دور حکومت میں مقرر تھے۔ غرناطہ میں جتنے (مسلمان) افراد گرفتار ہوئے تھے، وہ سب آزاد ہو جائیں گے۔ خواہ وہ کہیں کے رہنے والے ہوں، خاص طور پر وہ افراد جن کے نام درج کیے گئے ہیں۔ جو مسلمان قیدی فرار ہو کر غرناطہ پہنچ جائے، اس (عیسائی) مالک کا یا

کسی اور کا کوئی اختیار نہیں ہوگا۔ مالک کو اس کی قیمت بادشاہ خود ادا کرے گا۔ جو مسلمان یہاں سے گزر کر کسی اور جگہ جانا چاہیں، انھیں روکا نہیں جائے گا۔ وہ مقررہ مدت کے اندر شاہی سواری میں جائیں گے۔ ان کے ذمے کرایہ کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ اس مدت کے بعد وہ اپنے سامان کا دسواں حصہ ادا کریں گے اور کرایہ بھی دیں گے۔ کسی شخص کو کسی دوسرے کے جرم میں نہیں پکڑا جائے گا۔

جو شخص اسلام قبول کر لے، اسے دوبارہ عیسائی بننے پر مجبور نہیں کیا جائے گا اور جو مسلمان عیسائی ہو جائے، اسے چند دن روکا جائے گا حتی کہ اس کا حال معلوم ہو جائے۔ اسے ایک مسلمان حاکم اور ایک عیسائی حاکم کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ اگر وہ دوبارہ مسلمان ہونے سے انکار کر دے تو اسے اپنی مرضی کرنے کی اجازت ہوگی۔ جس نے جنگ کے دنوں میں کسی عیسائی کو قتل کیا تھا، اسے کوئی سزا نہیں دی

جائے گی اور اس سے وہ مال بھی واپس نہیں لیا جائے گا جو اس نے اس دوران میں اس سے یا کسی دوسرے عیسائی سے لیا ہوگا۔ کسی مسلمان کو عیسائی فوجوں کو کھانا پیش کرنے کا حکم نہیں دیا جائے گا۔ اسے کسی اور جگہ جانے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ پہلے سے رائج ٹیکسوں میں اضافہ نہیں کیا جائے گا۔ ان پر نئے عائد ہونے والے ٹیکس ختم کر دیے جائیں گے۔ کوئی عیسائی فصیل پر نہیں چڑھے گا اور مسلمانوں کے گھروں میں نہیں جھانکے گا اور کسی مسجد میں داخل نہیں ہوگا۔ ہر مسلمان عیسائیوں کے ملک میں چل پھر سکے گا۔ اس کی جان اور مال کو کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ ان کے لیے کوئی خاص امتیازی نشان ضروری نہیں ہوگا، جیسے یہودیوں کے لیے مخصوص علامت ہے۔ کسی شخص کو اذان، نماز، روزہ اور دیگر مذہبی اعمال ادا کرنے سے نہیں روکا جائے گا۔ جو اس (عمل کرنے والے) کا مذاق اڑائے، اسے سزا دی جائے گی۔ ان سے مقررہ مدت تک ٹیکس نہیں لیا جائے گا۔ ان تمام شرائط کی تصدیق روم کا حاکم کرے گا اور اپنے دستخط بھی کرے گا۔'' [1]

ابوعبداللہ محمد نصری جب غرناطہ سے نکلا تو ایک جگہ رک کر اس نے آنسو بہاتے ہوئے اس پر آخری نگاہ ڈالی۔ تب اس کی والدہ نے اس سے کہا تھا: ''جس ملک کو تم مردوں کی طرح سنبھال نہیں سکے، اب اس پر عورتوں کی طرح روتے کیوں ہو؟'' [2]

اس معاہدے کے مطابق عیسائی بادشاہوں کے لیے ضروری تھا کہ اس کی پابندی کرتے لیکن انھوں نے کلیسا کے بزرگوں اور پادریوں کے دباؤ پر اس کی شرطوں کو ایک ایک کر کے توڑ دیا۔ [3]

مسیحی فاتح لوگ قصر الحمراء میں داخل ہوئے تو ابوعبداللہ محمد بہتے آنسوؤں کے ساتھ اسے چھوڑ چکا تھا۔ وہ وقتی طور پر اندلس کے علاقے بشارہ میں منتقل ہوا اور اگلے سال وہ اسے ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر مراکش چلا گیا۔ وہاں کے حالات بہت خراب ہوگئے۔ مقّری نے اس کی حالت بیان کرتے ہوئے کہا ہے: ''مذکورہ بادشاہ ملیلہ میں ٹھہرنے کے بعد بیوی بچوں سمیت ''فاس'' (مراکش) شہر چلا گیا۔ وہ اپنے سابقہ اعمال پر معذرت خواہ تھا اور جو کچھ چھوڑ گیا تھا، اس پر دلگیر تھا۔ اس نے فاس میں اندلس کے انداز پر کچھ عمارتیں بنائیں۔ میں نے انھیں دیکھا ہے اور ان کے اندر بھی گیا ہوں۔'' ابوعبداللہ 940ھ میں فاس میں فوت

---

[1] نفح الطيب: 526,525/1. [2] ڈاکٹر عبدالحلیم عویس کی دراسة ثلاثين دولة: 53. [3] المسلمون المنصرون أو المرسكيون الأندلسيون: صفحة مهملة من تاريخ المسلمين في الأندلس: 33.

ہوگیا۔ اسے باب الشریعہ کے باہر عیدگاہ کے برابر دفن کیا گیا۔ اس کے پس ماندگان میں اس کے دو بیٹے تھے۔ ایک کا نام یوسف اور دوسرے کا نام احمد تھا۔ اس سلطان کی اولاد اب تک ''فاس'' شہر میں رہائش پذیر ہے۔ میں نے اس کی اولاد کو 1027ھ میں دیکھا تھا۔ وہ مساکین کے لیے وقف مال میں سے کچھ وصول کرتے تھے اور گداگروں میں شمار ہوتے تھے۔ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ. [1]

اندلس کے کئی ایک مرثیے لکھے گئے۔ ان میں سے ابوالبقاء رُندی کا قصیدہ یہاں درج کیا جاتا ہے:

① ہر چیز جب کمال کو پہنچ جائے تو اس میں کمی آنا شروع ہو جاتی ہے، اس لیے کسی انسان کو اچھی (عیش و عشرت اور آرام وراحت والی) زندگی سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے۔

② میں نے دیکھا ہے کہ یہ حالات تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ جس کے لیے کچھ مدت خوش گوار ہو، اس کے لیے بہت سی مدتیں ناگوار بھی ہوتی ہیں۔

③ یہ گھر (دنیا) کسی کے پاس ہمیشہ نہیں رہتا اور اس میں بھی سدا ایک جیسا حال نہیں رہتا۔

④ زمانہ ہر کشادہ لباس کو ضرور پھاڑ دیتا ہے جب تلواروں اور نیزوں کے وار اوچھے پڑیں۔

⑤ ہر تلوار کمزور ہو کر (آخر کار) فنا ہو جاتی ہے، خواہ (اس کا مالک) ذی یزن کا بیٹا ہو اور ایک نیام (کے بجائے) اس کی کئی نیامیں ہوں۔

⑥ یمن کے تاجدار بادشاہ کہاں ہیں؟ اور ان کے پھولوں کے تاج اور شاہی تاج کہاں ہیں؟

⑦ شداد نے ارم میں جو کچھ تعمیر کیا تھا، وہ کہاں ہے؟ اور فارس میں ساسان نے جو سیاست کی تھی، کہاں ہے؟

⑧ قارون نے جو سونا جمع کیا تھا، وہ کہاں ہے؟ عاد، شداد اور قحطان کہاں ہیں؟

⑨ ان سب پر (موت کا) وہ حکم آ گیا جسے ٹالا نہیں جا سکتا۔ وہ گزر گئے تو یوں لگتا ہے، گویا وہ کبھی تھے ہی نہیں۔

⑩ جو بھی حکومت یا دولت تھی، ایسے ہوگئی جیسے وہ خواب وخیال جسے کوئی اونگھنے والا بیان کرتا ہے۔

⑪ زمانے کی گردش دارا پر بھی آئی اور اس کے قاتل پر بھی۔ اور کسریٰ کی ماں پر بھی، پھر اسے کسی دربار میں جگہ نہ ملی۔

⑫ گویا صعب کے لیے کوئی کام آسان نہیں ہوا اور گویا سلیمان علیہ السلام نے کبھی دنیا پر بادشاہی نہیں کی۔

⑬ زمانے کے مصائب رنگارنگ صورتوں کے ہیں اور زمانے میں خوشیاں بھی ہیں اور غم بھی۔

---

[1] نفح الطیب: 529/1.

⑭ حادثات کے بعد تسلی کا باعث امور بھی ہوتے ہیں جو انھیں قابل برداشت بنا دیتے ہیں لیکن اسلام پر جو آفت آئی ہے، اس سے کسی طرح تسلی نہیں ہوسکتی۔

⑮ جزیرہ نمائے اندلس پر وہ مصیبت آئی ہے جس پر کسی کو تسلی نہیں دی جاسکتی۔ اسے دیکھ کر تو اُحد پہاڑ بھی گر پڑے اور نہلان مسمار ہو جائے۔

⑯ اسلام کے حوالے سے اسے (اندلس کو) نظر لگ گئی اور اس پر آزمائش آ گئی حتی کہ شہر اور علاقے اس (اسلام) سے خالی ہو گئے۔

⑰ «بَلَنْسِیہ» سے پوچھ، «مُرسیہ» کا کیا حال ہے؟ اور «شَاطِبَہ» کہاں ہے؟ اور «جَیَّان» کہاں گیا؟

⑱ وہ علوم کا گھر ''قرطبہ'' کہاں ہے جہاں بہت سے علماء کو بلند شان حاصل ہوئی؟

⑲ ''حمص'' کہاں ہے؟ اور اس میں جو سیر گاہیں تھیں اور اس میں جو بہتا ہوا میٹھا اور لبریز دریا تھا، وہ کہاں ہے؟[1]

⑳ وہ چھاؤنیاں (باقی نہ رہیں) جو ملک کے ستون تھیں، پھر (عمارت کے) باقی رہنے کی کیا امید ہوسکتی ہے جب ستون ہی نہ رہیں؟

㉑ روشن دین حنیف (اسلام) غم سے رو رہا ہے، جیسے کوئی پریشان حال (عاشق) دوست کے فراق میں روتا ہے۔

㉒ اس دیار پر (رو رہا ہے) جو اسلام سے خالی اور بے آباد ہو گیا اور وہاں کفر آباد ہو گیا۔

㉓ جہاں مسجدیں گرجے بن گئیں، ان میں ناقوس اور صلیب کے سوا کچھ نہیں۔

㉔ حتی کہ محرابیں بھی روتی ہیں، جبکہ وہ بے جان ہیں اور منبر بھی نوحہ کرتے ہیں، حالانکہ وہ لکڑیاں ہیں۔

㉕ اے وہ غافل جس کے لیے زمانے (کے حوادث) میں عبرت ہے! اگر تو نیند میں ہے تو زمانہ تو بیدار ہے۔

㉖ اے اکڑ کر چلنے والے جس کا وطن اس کا دل لبھاتا ہے! کیا ''حمص'' کے بعد بھی کوئی آدمی وطن کا دھوکا کھا سکتا ہے؟

---

[1] 92ھ/711ء میں اشبیلیہ کو فتح کرنے والوں میں شامی مجاہدین شامل تھے اور وہ یہیں بس گئے۔ انھوں نے اشبیلیہ کو حمص کا نام دیا تھا۔ جیسے شام کا حمص دریائے عاصی کے کنارے آباد ہے، اسی طرح اندلس کا حمص (اشبیلیہ) وادی الکبیر کے کنارے واقع تھا۔ (م ف)

㉗ اس مصیبت نے گزشتہ مصیبتیں بھلا ڈالیں۔ اور یہ مصیبت طویل زمانہ گزرنے پر بھی نہیں بھلائی جا سکے گی۔

㉘ اے عمدہ اور چست و چالاک گھوڑوں پر سواری کرنے والو! جو دوڑ کے میدان میں عقابوں کی طرح (تیز رفتار) ہیں۔

㉙ اور اے پتلی تیز ہندی تلواریں اٹھانے والو! جو غبار کے اندھیروں میں آگ کی طرح (چمکتی) ہیں!

㉚ کیا تمھیں اہلِ اندلس کی کچھ خبر ہے؟ ان لوگوں کی خبروں کو قافلے لیے پھرتے ہیں (ہر جگہ معلوم ہو چکی ہیں۔)

㉛ وہ کمزور (مسلمان) ہم سے کتنی فریاد کرتے ہیں جو قتل اور قید کیے گئے ہیں لیکن کوئی انسان ان کے لیے نہیں اُٹھتا۔

㉜ تمھارے درمیان، مسلمان ہونے کے باوجود، یہ لاتعلقی کیوں ہے؟ حالانکہ اللہ کے بندو! تم سب (ایک دوسرے کے) بھائی ہو۔

㉝ ان لوگوں کے معزز ہونے کے بعد ذلیل ہونے کا بدلہ کون لے گا؟ ظلم و جور نے ان کی حالت کچھ سے کچھ کر دی ہے۔

㉞ کل وہ اپنے گھروں میں بادشاہ تھے، آج وہ کافروں کے ملک میں غلام بن چکے ہیں۔

㉟ کاش! تو دیکھے کہ وہ کس طرح سرگرداں ہیں، ان کو راہ دکھانے والا کوئی نہیں۔ وہ ذلت کے طرح طرح کے لباس میں ملبوس ہیں۔

㊱ کتنی ہی ماؤں اور ان کے بچوں میں جدائی ڈال دی گئی ہے جیسے روحوں کو بدنوں سے جدا کر دیا جائے۔

㊲ وہ طلوع ہونے والے سورج کی سی حسین و جمیل بچیاں جو یاقوت اور مرجان جیسی ہیں۔

㊳ ان کو کافر زبردستی برائی پر مجبور کرتے ہیں۔ آنکھ روتی ہے اور دل پریشان ہے۔

㊴ ان حالات میں دل غم سے روتا ہے اگر دل میں اسلام اور ایمان موجود ہو۔[1]

اندلس پر عیسائیوں کا قبضہ ہو جانے کے فوراً بعد مسلمانوں پر دباؤ میں اضافہ ہو گیا۔ مقری تلمسانی کہتا ہے: ''اس کے بعد عیسائیوں نے وعدہ توڑ دیا اور ایک ایک شرط کی خلاف ورزی کرنے لگے۔ حالت یہاں تک پہنچ گئی کہ انھوں نے مسلمانوں کو عیسائیت قبول کرنے پر مجبور کرنا شروع کر دیا۔ اس کے اسباب میں

---

[1] نفح الطیب: 1/487,488.

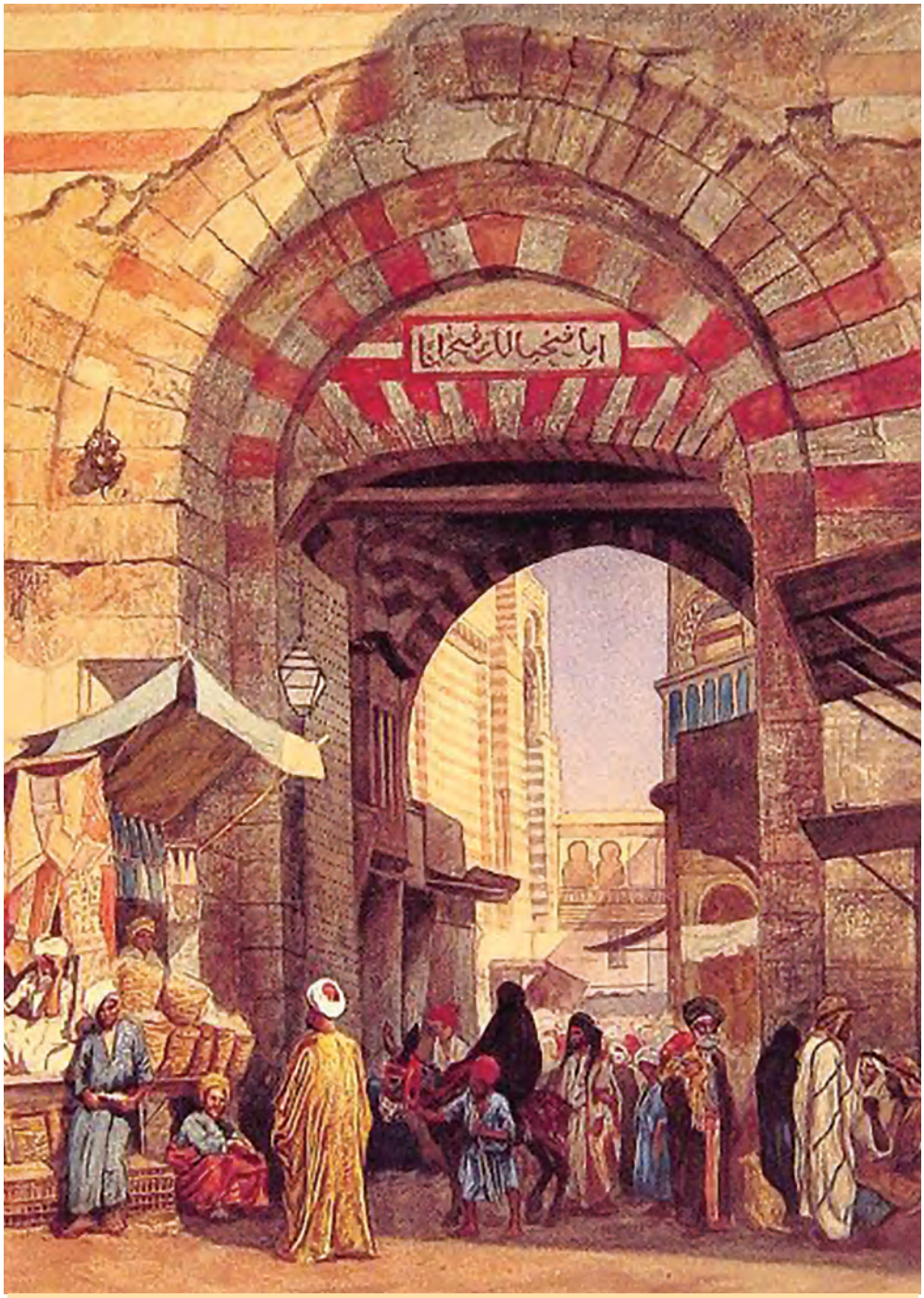

مصوّر کی نظر میں اندلس کا ایک مُورش (اسلامی) بازار جس کے صدر دروازے
کی پیشانی پر قرآنی آیت اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا کندہ ہے

ان کے نزدیک سب سے قوی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے کہا: پادریوں نے حکم جاری کر دیا ہے کہ جو عیسائی مسلمان ہوئے ہیں، انھیں زبردستی دوبارہ عیسائی بنا لیا جائے۔ اس پر عمل ہوا۔ لوگوں نے اعتراض تو کیا لیکن انھیں طاقت حاصل نہ تھی، پھر انھوں نے ایک اور ظالمانہ قدم اٹھایا۔ وہ کسی بھی مسلمان کو پکڑ کر کہتے: تیرا دادا عیسائی سے مسلمان ہوا تھا، لہٰذا تجھے ضرور عیسائی ہونا پڑے گا۔ جب یہ حرکت کثرت سے ہونے لگی تو بیازین (غرناطہ) والے حکام کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور انھیں قتل کر دیا۔ یہ بھی لوگوں کے عیسائی ہونے کا باعث بن گیا۔ وہ کہتے تھے: بادشاہ نے حکم جاری کیا ہے کہ جو شخص حاکم کے خلاف کھڑا ہوگا، اس کی سزا موت ہے، البتہ اگر وہ عیسائی ہو جائے تو موت سے بچ جائے گا۔ الغرض سب کے سب شہری بھی اور دیہاتی بھی عیسائی ہو گئے۔ کچھ لوگوں نے عیسائی ہونے سے انکار کیا اور گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ اس کا بھی انھیں فائدہ نہ ہوا۔ اسی طرح بعض شہروں، مثلاً: بلفیق اور اندرش وغیرہ نے انکار کیا تو دشمنوں نے ان پر لشکر کشی کی اور سب کو قتل یا گرفتار کر کے ختم کر دیا۔'' [1]

چار سال سے کم مدت میں تمام عہد و پیمان فراموش کر دیے گئے۔ تمام مسجدوں کو گرجاؤں میں تبدیل کر دیا گیا۔ آج تک وہ اسی حال میں ہیں۔ [2]

مسلمانوں کو عیسائیت اختیار کرنے کے لیے ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ انھیں اسلام سے زبردستی پھیر کر عیسائی بنا دیا گیا۔ جو شخص اپنے اسلام کو پوشیدہ رکھتا تھا، جب اس کا علم ہوتا تو اس پر ان عدالتوں میں مقدمہ چلایا جاتا جو ظلم میں مشہور تھیں۔ یہ عدالتیں ایسی تھیں کہ تاریخ انسانی میں ان کی مثال نہیں ملتی۔ یہ عدالتیں اسلام پر قائم رہنے والے کو زندہ جلانے کا فیصلہ سناتی تھیں اور اس کے پاس جو اسلامی کتابیں ملتی تھیں، انھیں بھی نذرِ آتش کر دیا جاتا تھا۔ یہ لوگ تاریخ میں ''مورسکیین'' [3] کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ بہت سے مسلمانوں نے مجبوراً اندلس چھوڑ کر شمالی افریقہ میں پناہ لے لی۔ [4]

---

[1] نفح الطيب: 527/1. [2] مواقف حاسمة في تاريخ الإسلام: 314. [3] ''مورسکیین'' کے بارے میں بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں، مثلاً: عبداللہ عنان کی کتاب ''نهاية الأندلس'' اور عبداللہ محمد جمال الدین کی کتاب ''المسلمون المنصرون المورسكيون في الأندلس وغيرهم.'' [4] مواقف حاسمة في تاريخ الإسلام: 315.

سلطنت عثمانیہ کے دور کی فتوحات

ساتویں صدی ہجری کے شروع میں، 617ھ میں ترکمان قبائل کے بعض خاندان وسط ایشیا سے نکلے اور منگول قبائل کے حملوں سے بچنے کے لیے مغرب کی طرف چل پڑے کیونکہ منگولوں نے عالم اسلام کے مشرقی علاقوں میں قتل و غارت اور فساد برپا کر رکھا تھا۔ ان میں سے بہت سے خاندانوں نے جب اپنے اصل وطن میں کچھ امن و امان محسوس کیا تو ان علاقوں میں واپس چلے گئے لیکن ان میں سے بعض لوگ ''ارطغرل بن سلیمان'' کی قیادت میں سلجوقیوں کے علاقے اناطولیہ میں ٹھہر گئے۔ وہ چاہتے تھے کہ انھیں اس علاقے میں رہنے کی اجازت مل جائے۔ اس اثنا میں ارطغرل اپنے کنبے سمیت کسی میدان میں پھر رہا تھا کہ اس نے قریب ہی ایک معرکہ برپا دیکھا۔ جنگ میں ایک فریق سلجوقی لشکر تھا جس کی قیادت سلطان علاء الدین کر رہا تھا اور دوسری طرف ایک بازنطینی لشکر تھا۔ ارطغرل نے فوراً بازنطینیوں کے خلاف سلجوقی مسلمانوں کے لشکر کی مدد کی۔ بازنطینیوں پر سلجوقیوں کی اس فتح میں اس مدد کا بہت حصہ تھا۔ [1] سلجوقیوں اور ان کے سردار علاء الدین نے ارطغرل اور اس کی جماعت کے اس تعاون کو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھا، چنانچہ انھیں اناضول (اناطولیہ) کی مغربی سرحد پر رومی محاذ جنگ کے قریب جاگیر دے دی۔ [2]

---

[1] سلجوقیوں کے مقابلے میں بازنطینی نہیں بلکہ تاتاری (منگول یا مغل) تھے۔ ڈاکٹر محمد عزیر لکھتے ہیں: ''فتح حاصل کرنے کے بعد ارطغرل کو معلوم ہوا کہ جس فریق کی اس نے بروقت مدد کی تھی، وہ سلطان علاء الدین سلجوقی کی فوج تھی جسے تاتاریوں کی ایک بڑی فوج نے گھیر رکھا تھا۔'' (''دولتِ عثمانیہ''، ڈاکٹر محمد عزیر: 14/1) ڈاکٹر نصیر احمد ناصر کے بقول: ''ارطغرل نے ساتھیوں سے کہا: مردانگی کا تقاضا یہ ہے کہ کمزور کی مدد کی جائے، چنانچہ وہ لڑائی میں کود پڑے اور تاتاری جو ہلاکو خان کے سپاہی تھے اور کامیاب ہو رہے تھے، میدانِ جنگ سے بھاگ نکلے۔ لڑائی ◀◀

اس طرح انھیں موقع مل گیا کہ رومیوں سے علاقہ چھین کر اپنی حدود وسیع کر لیں۔ رومیوں کے خلاف جہاد میں سلجوقی طاقتور حلیف ثابت ہوئے۔ مشترکہ دشمن کی وجہ سے اس نوزائیدہ ترکمانی سلطنت کے رومی سلجوقیوں سے دوستانہ تعلقات قائم ہوگئے، تاہم اس قربت میں بعض دیگر عوامل کا بھی دخل تھا۔ ارطغرل کی زندگی میں یہ تعلق ہمیشہ قائم رہا حتی کہ جب 699ھ (1299ء) میں وہ فوت ہوگیا[1] تو اس کے بعد اس کا بیٹا ''عثمان'' حکمران بنا۔ وہ بھی اپنے باپ کی طرح رومی علاقے فتح کرنے کی پالیسی پر قائم رہا۔[2]

◂◂ ختم ہونے کے بعد معلوم ہوا کہ کمزور فریق سلجوقی تھے۔ (''تاریخ ترکیہ''، ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، ص:24، 25) مؤرخ اسلام اکبر شاہ خان کہتے ہیں: ''یہ تاریخ ساز جنگ 621ھ میں سلجوقی فرمانروا علاء الدین کیقباد اوّل اور مغلوں (تاتاری فوج) کے درمیان لڑی گئی تھی۔'' (''تاریخ اسلام''، اکبر شاہ خان نجیب آبادی) ''ترکمان سردار سلیمان کا بیٹا ارطغرل اپنے 444 ہمراہیوں کو لے کر کمزور فریق کی طرف سے زبردست فریق پر ٹوٹ پڑا۔ مغلوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ بہت سی لاشیں چھوڑ کر بھاگ گئے۔'' (اُردو دائرہ معارف اسلامیہ: 2/386) (م ف) 2 تاريخ الدولة العلية العثمانية: 115، و العمثانيون في التاريخ والحضارة: 14، و تاريخ سلاطين آل عثمان: 27.

1 ''ارطغرل نے 687ھ/ 1288ء میں نوے سال کی عمر میں انتقال کیا اور سغوت (سُگُد) کے قریب دفن ہوا۔'' (''تاریخ ترکیہ''، ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، ص:26۔ ''دولتِ عثمانیہ''، ڈاکٹر محمد عزیر: 1/15) 2 قيام الدولة العثمانية: 180، و تاريخ الدولة العلية: 115، و تاريخ سلاطين آل عثمان: 29.

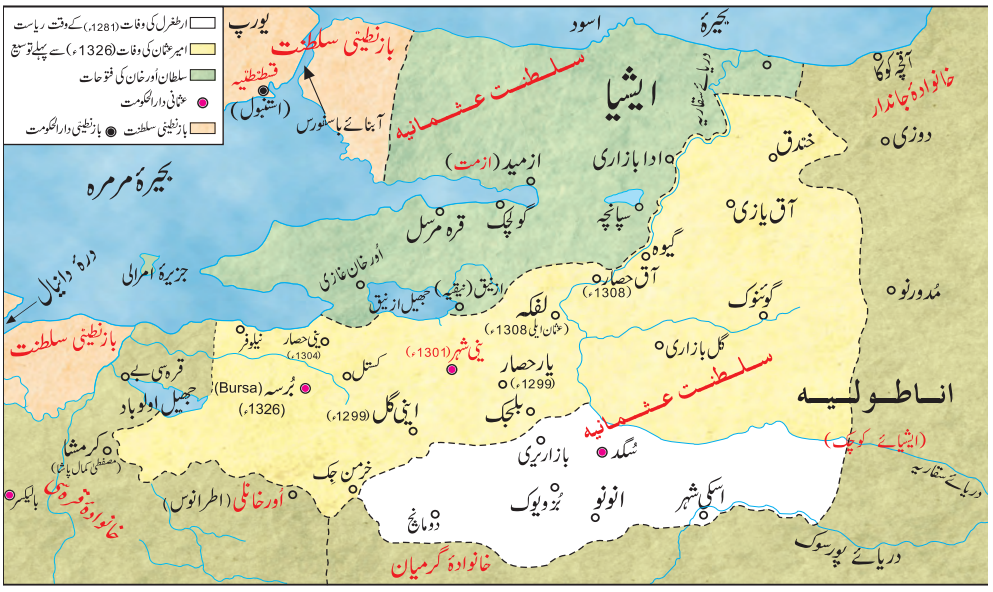

سلطنت عثمانیہ کی توسیع (1326ء تک)

اس نے رومیوں کے کئی اہم قلعے فتح کیے جس سے سلجوقی بادشاہ ''علاء الدین سوم'' بہت خوش ہوا، چنانچہ اس نے عثمان کی قدر افزائی کی اور اسے خاص سلطانی القاب عطا فرمائے۔ اس کے بعد مختلف اسباب، مثلاً منگول حملے کی وجہ سے سلجوقیوں کی حکومت کمزور ہوتی گئی۔ سلطان علاء الدین سوم 699ھ میں فوت ہوا تو اس کے کمانڈروں نے اپنے اپنے علاقوں میں حکومتیں قائم کر لیں۔ عثمان بن ارطغرل نے بھی اناضول کے ایک حصے میں آزاد سلطنت قائم کر لی اور اپنے لیے عثمانیوں کے بادشاہ کا لقب پسند کر لیا، چنانچہ اسے بجا طور پر سلطنت عثمانیہ کا بانی قرار دیا جاتا ہے۔[1]

عثمان نے ''ینی شہر'' کو اپنا دارالحکومت بنا لیا۔ اس طرح ایک آزاد عثمانی سلطنت منصۂ شہود پر آئی۔ اس کے بعد سلطان کے بیٹوں نے اسلامی علاقوں میں بھی اور یورپی علاقوں میں بھی اپنی سلطنت کو وسعت دینا شروع کر دی۔ انھیں اسلامی ملکوں کے اندر سے اور باہر سے، بالخصوص یورپ میں بڑی بڑی مخالف قوتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ 923ھ میں آلِ عثمان ممالیکِ مصر کی حکومت ختم کرنے میں کامیاب ہو گئے اور ساتھ ہی قاہرہ میں عباسی خلافت ختم ہو گئی۔ اس دوران میں انھوں نے مصر، شام، عراق، حجاز اور شمالی افریقہ پر قبضہ کر لیا۔ تب خلافت عثمانی سلطنت کی طرف منتقل ہو گئی جبکہ وہ عثمانی سلطان سلیم اول کے ہاتھوں سب سے طاقتور

---

[1] تاريخ الدولة العثمانية: 90.

اسلامی سلطنت بن چکی تھی۔ [1]

عثمانیوں نے خلافت کا منصب حاصل کرنے سے پہلے اہلِ یورپ سے خود یورپ میں اور بحر ابیض متوسط (بحیرۂ روم) میں شدید جنگیں کیں۔ انھوں نے عثمانی فتوحات کے دوران میں یورپ کے مختلف علاقوں اور میدانوں میں عیسائیوں کے خلاف جنگیں لڑیں۔ اسی طرح جدید دور میں عثمانیوں نے یورپ کے عالم اسلام پر شدید حملوں کا مقابلہ کیا، خواہ وہ دسویں صدی ہجری کے شروع میں جغرافیائی دریافتوں کے بعد ہوئے ہوں یا تیرہویں صدی ہجری میں ہونے والے استعماری حملے ہوں۔ یورپ کے خلاف عثمانیوں کا جہاد جاری رہا حتی کہ پہلی عالمی جنگ کے فوراً بعد خلافت عثمانیہ کا خاتمہ ہوگیا۔

---

[1] ڈاکٹر محمد حرب کی العثمانیون في التاریخ والحضارة: 27.

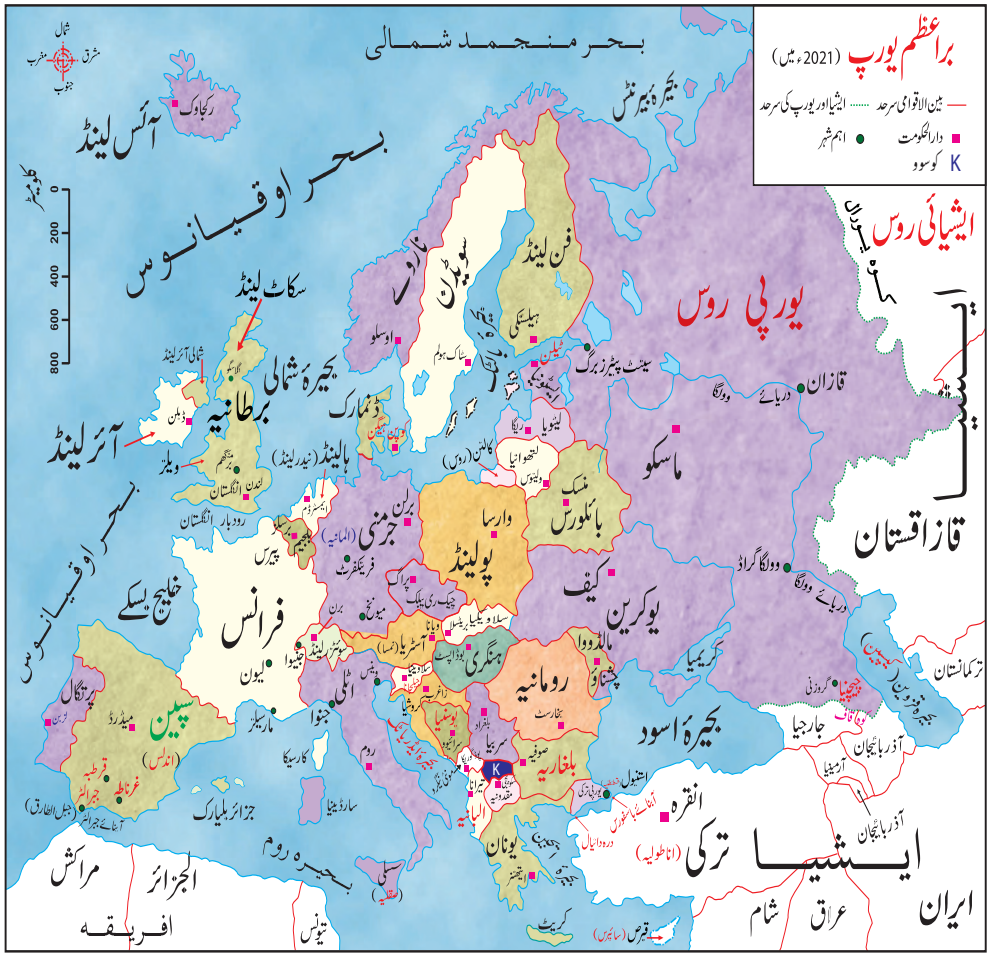

① قسطنطنیہ کی فتح

قسطنطنیہ دنیا کے اہم ترین شہروں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کی بنیاد بازنطینی بادشاہ قسطنطین اول نے 330ء میں رکھی تھی۔ اس شہر کا دنیا میں محل وقوع بے مثال ہے حتی کہ اس کے بارے میں کسی نے کہا ہے: ''اگر ساری دنیا ایک ملک بن جائے تو اس کا دارالحکومت بننے کے لیے سب سے مناسب شہر قسطنطنیہ ہوگا۔''[1]

بازنطینیوں نے اس کے تعمیر ہوتے ہی اسے اپنا دارالحکومت بنا لیا تھا۔ یہ دنیا کے سب سے بڑے اور اہم ترین شہروں میں سے ایک ہے۔ مسلمانوں نے جب بازنطینی سلطنت سے جہاد شروع کیا تو اس ٹکراؤ کے دوران میں اس شہر کو خاص اہمیت حاصل رہی۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے متعدد مواقع پر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو اس شہر کی فتح کی خوشخبری دی تھی، مثلاً غزوۂ خندق کے دوران میں بھی یہ خوشخبری دی گئی تھی۔[2]

اسی وجہ سے مسلمانوں کے خلفاء اور جہاد کے قائدین نے مختلف زمانوں میں اسے فتح کرنے کی کوشش کی، اس امید پر کہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث ان پر صادق آجائے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«لَتُفْتَحَنَّ قُسْطَنْطِينِيَّةُ عَلَى يَدِ رَجُلٍ، فَلَنِعْمَ الْأَمِيرُ أَمِيرُهَا، وَلَنِعْمَ الْجَيْشُ ذٰلِكَ الْجَيْشُ»

''قسطنطنیہ ایک آدمی کے ہاتھوں فتح ہوگا، اس لشکر کا امیر کتنا اچھا ہے! اور وہ لشکر کیا خوب لشکر ہے!''[3]

چنانچہ مسلمان مجاہدین کی افواج سیدنا معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما[4] کے وقت ہی سے اس پر حملہ آور ہوتی رہی ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ نے اس پر پہلا حملہ 44ھ میں کیا۔[5]

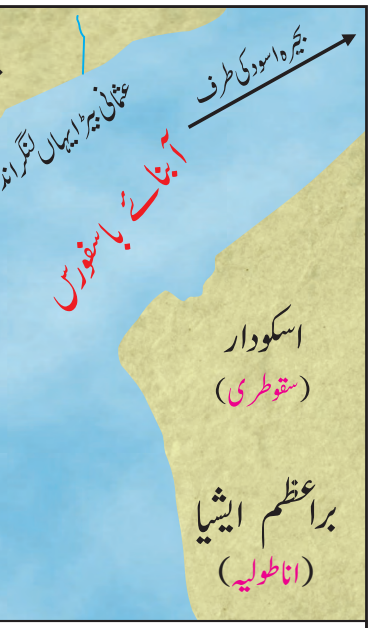

فتح قسطنطنیہ
(20 جمادی الاولیٰ 857ھ/29 اپریل 3
عثمانی عساکر قسطنطنیہ کے گر
عثمانی جہازوں نے شاخ زریں میں جڑ کر
پُل بنا دیا جس کے راستے شہر پر آخری

---

[1] سالم رشیدی کی ''محمد الفاتح'': 54۔ [2] مسند أحمد: 303/4، اس شہر کی فتح کی متعدد بشارتوں کے لیے دیکھیے: مسند أحمد: 178/1، 174/2-176، 193/4. [3] مسند أحمد: 335/4. [4] سب سے پہلے سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے 48ھ (668ء) میں ایک لشکر قسطنطنیہ کی فتح کے لیے روانہ کیا۔ (''دولت عثمانیہ''، ڈاکٹر عزیر احمد: 108/1) [5] تاريخ خليفة بن خياط: 207-211، و تاريخ الطبري: 131/6، 164، و الكامل: 420/3.

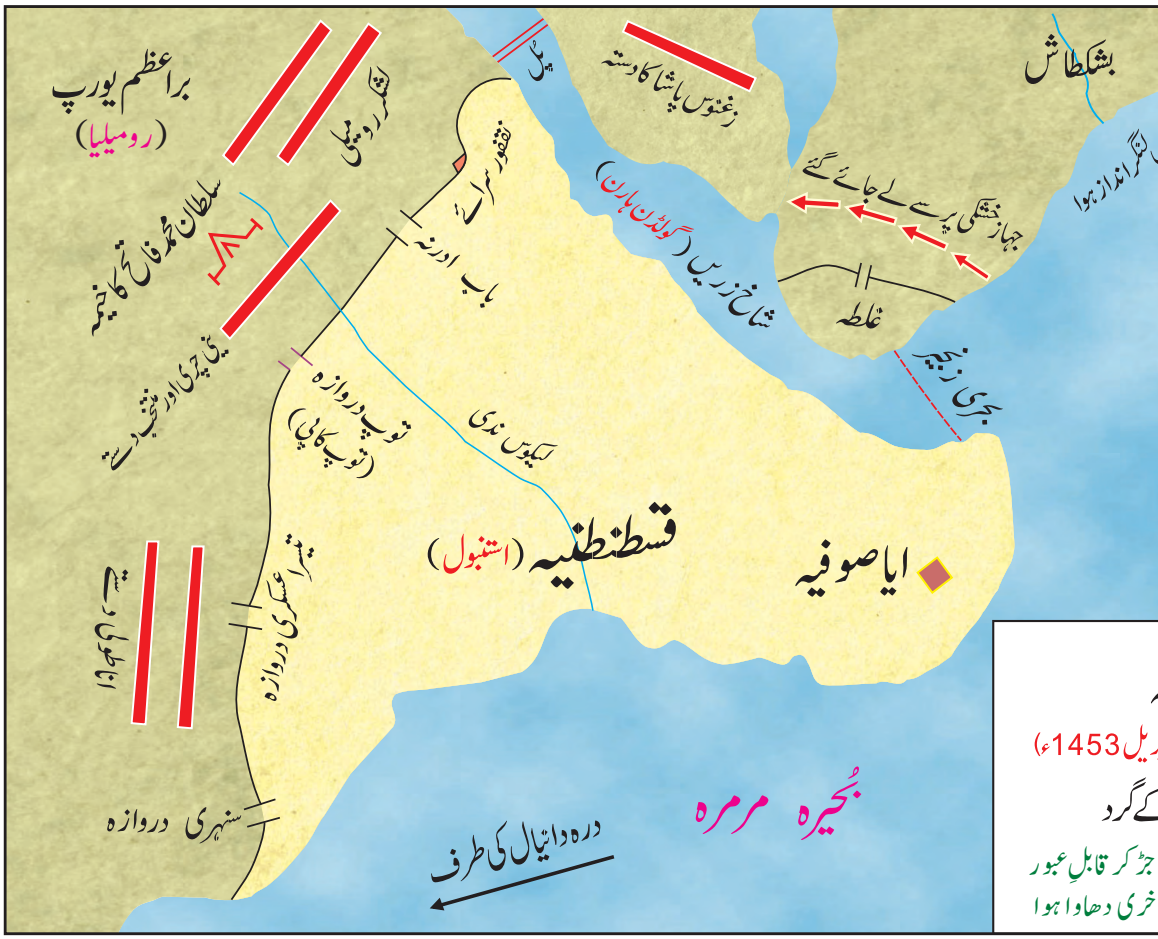

لیکن یہ حملہ کامیاب نہ ہوسکا۔ اس کے بعد بھی ان کے عہد میں بار بار حملے ہوتے رہے لیکن وہی نتیجہ برآمد ہوا۔ اموی دور حکومت میں قسطنطنیہ کی فتح کے لیے ایک اور کوشش کی گئی۔ اس شہر پر بنو امیہ کا یہ حملہ سب سے شدید شمار ہوتا ہے۔ یہ حملہ سلیمان بن عبدالملک کے دور میں 98ھ میں ہوا۔ [1]

اس کے بعد بھی قسطنطنیہ کو فتح کرنے کی کوششیں ہوتی رہیں۔ ان سے اندرونی حالات بھی متاثر ہوئے۔ ان میں وہ حملہ اہم ہے جو ہارون الرشید کے دور حکومت میں 190ھ میں ہوا۔ [2]

عثمانی دور میں مسلمانوں نے نئے سرے سے قسطنطنیہ فتح کرنے کی کوشش کی۔ اس کی ابتدا سلطان بایزید (یلدرم) کے دور میں ہوئی۔ اس کی افواج نے 796ھ (مطابق 1393ء) میں پوری قوت سے اس کا

---

[1] تاريخ خليفة بن خياط: 315، و تاريخ الطبري: 117/8، و الكامل: 28/5، 43، و ابن خلدون کی العبر: 70/3.

[2] تاريخ خليفة بن خياط: 458، و تاريخ الطبري: 69/10، و الكامل: 186,185/6.

استنبول میں اُردا کوئی مسجد (طلوعِ آفتاب کا منظر)

محاصرہ کر لیا۔ [1]

سلطان نے بازنطینی بادشاہ سے بات چیت کی کہ یہ شہر پرامن طور پر مسلمانوں کے حوالے کر دیا جائے لیکن وہ ٹال مٹول کرنے لگا۔ اس نے قسطنطنیہ پر مسلمانوں کے حملے کا مقابلہ کرنے کے لیے یورپ سے مدد حاصل کرنے کی کوشش کی۔ عین اس وقت تیمورلنگ کی قیادت میں مغل افواج عثمانی علاقے میں گھس آئیں، چنانچہ سلطان بایزید کو مغلوں کا مقابلہ کرنے کے لیے قسطنطنیہ کا محاصرہ ختم کر کے اپنی فوجوں کو پیچھے ہٹانا پڑا۔ تب مغلوں سے بایزید کی وہ مشہور جنگ ہوئی جو ''معرکہ انقرہ'' کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں بایزید (یلدرم) گرفتار ہوا اور وہ 1402ء میں قید ہی میں فوت ہو گیا۔ [2]

---

[1] تاریخ سلاطین آل عثمان: 18، محمد فرید بک، حوالہ مذکورہ بالا: 139، محمد مصطفی صفوت کی فتح القسطنطینیة: 12، نیز دیکھیے: ابن حجر عسقلانی کی أنباء الغمر في أبناء العمر: 247/3. [2] تاریخ سلاطین آل عثمان: 20، و الغمر: 247/3، و التحفة الحلیمیة: 50، و تاریخ الدولة العلیة: 51، و محمد الفاتح: 53.

تیمور کے حملے کا نتیجہ یہ ہوا کہ عثمانی سلطنت وقتی طور پر ختم ہوگئی اور قسطنطنیہ کو فتح کرنے کی سوچ کچھ وقت کے لیے رک گئی۔

جونہی ملک کے حالات پرسکون ہوئے، جہاد کی روح نئے سرے سے بیدار ہوگئی۔ سلطان مراد دوم، جس کا دور حکومت 824ھ سے 855ھ تک (1421ء تا 1451ء) ہے، نے قسطنطنیہ فتح کرنے کی کئی بار کوشش کی۔ اس کے دور میں عثمانی فوجوں نے کئی بار اس کا محاصرہ کیا۔ ان کوششوں کے دوران میں بازنطینی بادشاہ، سلطان کے بعض باغیوں کی مدد کر کے عثمانیوں کی صفوں میں اختلاف ڈال دیتا تھا، اس طرح وہ اس کی توجہ اصل ہدف سے ہٹانے میں کامیاب ہو جاتا تھا، چنانچہ عثمانی سلطان مراد دوم کے بعد اس کے بیٹے محمد الفاتح ہی کے دور میں کامیاب ہو سکے۔

محمد فاتح اپنے والد کی زندگی میں بھی بعض شاہی فرائض انجام دیتا تھا، لہٰذا اس نے بازنطینیوں سے جنگوں کے دوران میں مختلف حالات کا بذاتِ خود مشاہدہ کیا تھا اور وہ اس بارے میں عثمانیوں کی گزشتہ جدوجہد سے پوری طرح واقف تھا جو انھوں نے قسطنطنیہ کی فتح کے لیے کی تھی بلکہ وہ ان کوششوں سے بھی باخبر تھا جو اس سے پہلے مختلف اسلامی ادوار میں کی جا چکی تھیں، چنانچہ جب اس نے 855ھ مطابق 1451ء میں حکومت سنبھالی، تبھی سے اس کی نظریں قسطنطنیہ پر تھیں اور وہ اسے فتح کرنے کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔ وہ علماء سے محبت رکھتا تھا اور مجلس میں انھیں اپنے قریب بٹھاتا تھا۔ غالباً اسی وجہ سے اسے نبیٔ اکرم ﷺ کے وہ فرامین یاد تھے جن میں قسطنطنیہ کو فتح کرنے والے کی تعریف کی گئی ہے، ان میں سے ایک حدیث پہلے بیان کی جا چکی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا تھا: «لَتُفْتَحَنَّ قُسْطَنْطِينِيَّةُ عَلٰى يَدِ رَجُلٍ، فَلَنِعْمَ الْأَمِيرُ أَمِيرُهَا، وَلَنِعْمَ الْجَيْشُ ذٰلِكَ الْجَيْشُ» ''قسطنطنیہ ایک آدمی کے ہاتھوں فتح ہوگا۔ اس لشکر کا امیر کتنا اچھا ہے! اور وہ لشکر کیا خوب لشکر ہے!'' اس وجہ سے محمد الفاتح کی یہ شدید خواہش تھی کہ وہی رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کا مصداق بن جائے۔

فتح قسطنطنیہ کی تیاری

سلطان فاتح نے قسطنطنیہ کی فتح کے لیے ہمہ جہت تیاری کی۔ مختلف منصوبے ترتیب دیے۔ اس نے عثمانی لشکر کو افرادی قوت کے لحاظ سے مضبوط بنانے کے لیے بہت زیادہ محنت کی حتی کہ فوج کی تعداد ڈھائی لاکھ تک پہنچ گئی۔ اس دور کی مختلف ریاستوں کی افواج سے موازنہ کیا جائے تو یہ بہت بڑی تعداد ہے۔ اس کے

علاوہ اس نے سپاہیوں کو جنگ کی مختلف مہارتوں کی تربیت دینے اور مختلف قسم کے اسلحہ کے استعمال کرنے پر خاص توجہ دی جس سے وہ آیندہ جہاد کے قابل ہو گئے۔ علاوہ ازیں فاتح نے انھیں روحانی طور پر تیار کرنے اور ان میں جہاد کی روح پھونکنے پر بھی خاص توجہ دی۔ اس نے انھیں یاد دلایا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس لشکر کی تعریف کی ہے جو قسطنطنیہ کو فتح کرے گا اور شاید یہی وہ لشکر ہو جس کی طرف آپ ﷺ نے اشارہ فرمایا تھا۔ اس سے ان میں بے مثال بہادری اور روحانی قوت پیدا ہوگئی۔ لشکر کی صفوں میں علماء کی بکثرت آمد نے ان کے عزائم پختہ کرنے اور اللہ کے احکام کے مطابق حقیقی جہاد سے ان کا تعلق قائم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

سلطان نے آبنائے باسفورس پر یورپ کی طرف قلعہ ''رولی حصار'' تعمیر کروایا۔ اس کے مقابل آبنائے کی دوسری طرف ایشیا کی سرزمین پر ایک قلعہ موجود تھا جو سلطان بایزید کے دور حکومت میں تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ مقام آبنائے باسفورس کا سب سے تنگ مقام ہے۔ بازنطینی بادشاہ نے سلطان فاتح کو قلعے کی تعمیر سے روکنے کی کوشش کی۔ اس کے عوض اس نے بہت سا مال ادا کرنے کا وعدہ کیا لیکن فاتح نے قلعہ تعمیر کرنے کا ارادہ نہ بدلا کیونکہ وہ اس مقام کی فوجی اہمیت سے واقف تھا۔ آخر ایک بلند اور مضبوط قلعہ مکمل ہوگیا۔ اس کی بلندی بیاسی میٹر تک پہنچ گئی۔ اس طرح آمنے سامنے دو قلعے بن گئے جن کے درمیان صرف چھ سو ساٹھ میٹر کا فاصلہ تھا۔ ان کی توپوں کے گولے مشرقی علاقوں، مثلاً سلطنت طرابزون وغیرہ سے آنے والے ان جہازوں کو قسطنطنیہ تک پہنچنے سے روک سکتے تھے

سلطان محمد فاتح کی بنا کردہ مسجد ''فاتح جامع'' (استنبول)

جن کے بارے میں خطرہ تھا کہ وہ ضرورت پڑنے پر شہر کے محصورین کی مدد کے لیے آسکتے ہیں۔[1]

اس کے علاوہ سلطان نے تمام ضروری ہتھیار جمع کرنے پر توجہ دی جو آیندہ کارروائی کے لیے ضروری تھے۔ ان میں سب سے اہم توپوں کی تیاری تھی۔ ان کے بارے میں سلطان نے خصوصی اہتمام کیا کہ ہنگری سے ایک کاریگر بلوایا جس کا نام ''اربان'' تھا۔ وہ توپیں بنانے کا ماہر تھا۔ سلطان نے گرم جوشی سے

[1] تاریخ الدولة العثمانية:131، و تاریخ الدولة العلية:161، و تاریخ سلاطین آل عثمان:26.

خلیج شاخِ زریں (گولڈن ہارن) اور بحیرۂ مرمرہ پر واقع قدیم قسطنطنیہ (استنبول) کا نقشہ

اس کا استقبال کیا اور اسے تمام مادی، مالی اور انسانی وسائل مہیا کیے، چنانچہ اس کاریگر نے متعدد بڑی توپیں بنا دیں جن میں سرفہرست مشہور ''سلطانی توپ'' تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا وزن کئی ٹن تھا۔ اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کے لیے کئی سو بَیل درکار ہوتے تھے۔ سلطان نے اپنی نگرانی میں اسے تیار کروایا اور اس کا تجربہ کیا۔ [1]

اس تمام تیاری کے علاوہ سلطان فاتح نے عثمانی بحری بیڑے پر خاص توجہ دی۔ اس نے اسے خوب مضبوط کیا اور اس میں کئی اقسام کے جہاز شامل کیے تاکہ قسطنطنیہ پر حملہ کرنے میں وہ بھی اپنا کردار ادا کر سکے۔ یہ ایک سمندری شہر تھا جس کا محاصرہ کرنے کے لیے بحری فوج کی ضرورت تھی جو یہ مہم انجام دے سکے۔ یہ ذکر ہو چکا ہے کہ اس مقصد کے لیے جو بحری جہاز تیار کیے گئے تھے، ان کی تعداد چار سو سے زیادہ تھی۔ [2]

---

[1] تاريخ الدولة العثمانية: 132، و محمد الفاتح: 79، و فتح القسطنطينية: 74. [2] سلاطين آل عثمان: 26، و محمد الفاتح: 90.

سلطان فاتح نے قسطنطنیہ پر حملہ کرنے سے پہلے اپنے مختلف مخالفین سے معاہدے کر لیے تا کہ وہ یکسو ہو کر ایک دشمن سے نبٹ سکے، چنانچہ اس نے ایشیائے کوچک میں قرامان کی ریاست سے معاہدہ کیا۔ اسی طرح اس نے ''ہنگری'' اور ''بندقیہ'' (وینس) سے معاہدے کیے۔ یہ یورپی ہمسایہ ریاستیں تھیں۔ لیکن جب قسطنطنیہ پر بالفعل حملہ شروع ہوا تو یہ معاہدے قائم نہ رہ سکے کیونکہ دوسرے شہروں کے علاوہ ان ریاستوں کی فوجیں بھی قسطنطنیہ کے دفاع میں شریک ہونے کے لیے پہنچ گئیں۔ [1]

یورپی ریاستوں نے اپنے ہم قوم عیسائیوں کی مدد کرتے ہوئے مسلمانوں سے کیے ہوئے تمام عہد و پیمان فراموش کر دیے۔ جب سلطان فتح حاصل کرنے کے لیے تیاریاں کر رہا تھا تو بازنطینی بادشاہ نے اسے اس کے ہدف سے ہٹانے کے لیے سرتوڑ کوشش کی۔ اس نے بہت سا مال و دولت اور طرح طرح کے تحفے پیش کیے اور سلطان کے بعض مشیروں کو رشوت بھی دی تا کہ وہ اس کے فیصلے پر اثر انداز ہونے کی کوشش کریں۔ [2]

لیکن سلطان اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا عزم کیے ہوئے تھا۔ وہ ان حربوں سے متاثر ہو کر اپنے مقصود سے پیچھے نہیں ہٹا۔ جب بازنطینی بادشاہ نے دیکھا کہ سلطان اپنے مقصد کے حصول کا پختہ عزم رکھتا ہے تو اس نے یورپ کے مختلف ملکوں اور شہروں سے مدد مانگ لی جن میں سرفہرست کیتھولک فرقے کا سربراہ پوپ تھا، حالانکہ اس وقت بازنطینی سلطنت آرتھوڈکس چرچ کے تابع تھی۔ ان دونوں فرقوں کے درمیان شدید عداوت تھی لیکن بادشاہ پوپ کو خوش کرنے کے لیے اس کے قریب ہونے پر مجبور تھا۔ اس نے کہا کہ وہ مشرقی آرتھوڈکس فرقے کو متحد کر کے پوپ کے ماتحت کرنے پر تیار ہے جبکہ درحقیقت آرتھوڈکس اس اشتراک کے لیے آمادہ نہ تھے۔ پوپ نے اپنا ایک نمائندہ قسطنطنیہ بھیجا جس نے ایا صوفیا کے گرجے میں تقریر کی۔ اس نے پوپ کے پاس واپس آ کر دونوں فرقوں کو متحد کرنے کا اعلان کر دیا لیکن اس سے شہر کے آرتھوڈکس عوام ناراض ہو گئے۔ انھوں نے بادشاہ کے کیتھولک سے اشتراک کے خلاف تحریک چلا دی حتی کہ ایک آرتھوڈکس لیڈر نے یہاں تک کہہ دیا: ''میں بازنطینی علاقے میں لاطینی ہیٹ دیکھنے کی نسبت ترکی عمامہ دیکھنا زیادہ پسند کروں گا۔'' [3]

---

[1] تاريخ الدولة العثمانية: 132، و تاريخ الدولة العلية: 162، و فتح القسطنطينية: 70، و تاريخ سلاطين آل عثمان: 58. [2] تاريخ الدولة العثمانية: 134، و فتح القسطنطينية: 69. [3] تاريخ الدولة العثمانية: 132، و محمد الفاتح: 89، و فتح القسطنطينية: 55.

شہرِ قیصر پر حملہ

قسطنطنیہ کا شہر تین اطراف سے سمندر سے گھرا ہوا ہے۔ ایک طرف آبنائے باسفورس ہے، دوسری طرف بحیرۂ مرمرہ اور تیسری طرف گولڈن ہارن [1] جس کی حفاظت کے لیے ایک بہت موٹی آہنی زنجیر اس کے دہانے میں لگائی گئی تھی۔ اسے صرف اس وقت ہٹایا جاتا تھا جب کسی جہاز کو گزارنا مقصود ہو۔ علاوہ ازیں خشکی کی طرف بحیرۂ مرمرہ کے ساحل سے گولڈن ہارن تک دو فصیلیں تھیں جن کے درمیان دریائے لیکوس

[1] شاخ زریں (Golden Horn) ایک خلیج ہے جو سینگ کی طرح آبنائے باسفورس اور بحیرۂ مرمرہ کے سنگم سے نکل کر شمال میں خشکی کے اندر تک چلی گئی ہے۔ ترک اسے صرف خلیج (Halic) کہتے ہیں۔ (م ف)

بہتا تھا۔ دونوں فصیلوں کے درمیان خالی جگہ تھی جو ساٹھ فٹ چوڑی تھی۔ اندرونی دیوار چالیس فٹ بلند تھی جس پر برج بنے ہوئے تھے، برجوں کی بلندی ساٹھ فٹ تک پہنچتی تھی۔ بیرونی فصیل کی بلندی تقریباً پچیس فٹ تھی۔ اس پر جگہ جگہ برج بنے ہوئے تھے جن میں فوج بٹھائی ہوئی تھی۔ [1]

الغرض فوجی نقطہ نگاہ سے قسطنطنیہ کا دفاعی نظام دنیا بھر کے شہروں میں سب سے بہتر سمجھا جاتا تھا کیونکہ اسے فصیلوں اور چھوٹے بڑے قلعوں کے علاوہ قدرتی دفاع بھی حاصل تھا، چنانچہ اس میں داخل ہونا بہت مشکل تھا۔ اسی وجہ سے اس میں حملہ آوروں کے داخل ہونے کی دسیوں عسکری کوششیں ناکام ہوچکی تھیں۔ ان میں گیارہ کوششیں وہ ہیں جو مسلمانوں نے اس سے پہلے کی تھیں۔

سلطان فاتح نے اَدرنہ میں مجاہدین اور اسلحہ جمع کرنے کی صورت میں مکمل تیاری کر رکھی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ قسطنطنیہ کا جائزہ لیتا اور وہاں کے حالات معلوم کرتا رہتا تھا۔ وہ اس کے محاصرے کے لیے ضروری نقشے بھی تیار کرواتا رہتا تھا۔ وہ خود بھی معلوماتی دورے کرتا تھا جن میں وہ قسطنطنیہ کی فصیلوں اور دفاعی انتظامات کا جائزہ لیتا تھا۔ [2]

سلطان نے ادرنہ سے قسطنطنیہ تک پختہ سڑک تیار کروائی تاکہ بہت بڑی توپیں اس پر سے کھینچ کر قسطنطنیہ لے جائی جاسکیں۔ یہ توپیں دو ماہ کی مدت میں ادرنہ سے قسطنطنیہ کے قریب پہنچیں۔ لشکر کا ایک حصہ ان کی

---

[1] سلاطین آل عثمان: 20، و محمد الفاتح: 96، و العثمانیون والبلقان: 88. [2] محمد الفاتح: 82، و تاریخ الدولة العثمانیة: 132، و فتح القسطنطینیة: 57.

غلطہ ٹاور، غلطہ پُل، قراکوئی ضلع اور شاخ زرّیں (استنبول)

حفاظت کررہا تھا حتی کہ وہ وقت آ گیا جب عثمانی افواج خود سلطان فاتح کی قیادت میں قسطنطنیہ کے مضافات تک پہنچ گئیں۔ یہ جمعرات 26 ربیع الاول 857ھ مطابق 6 اپریل 1453ء کا دن تھا۔ افواج کی تعداد تقریباً ڈھائی لاکھ تھی۔ سلطان نے افواج کو جمع کر کے ایک زبردست تقریر کی جس میں جہاد کرنے اور فتح یا شہادت کے حصول کی ترغیب دی۔ انھیں دشمن کا سامنا ہونے پر جہاد اور قربانی کے جذبے سے کام لینے کی تلقین کی۔ اس نے قرآن مجید کی وہ آیات سنائیں جن میں جہاد کی ترغیب ہے۔ نبی ﷺ کے وہ ارشادات یاد دلائے جن میں آپ ﷺ نے قسطنطنیہ کی فتح کی بشارت دی ہے اور اسے فتح کرنے والے لشکر اور اس کے کمانڈر کی فضیلت بیان فرمائی ہے۔ اس عزت کا ذکر کیا جو اس فتح سے اسلام اور مسلمانوں کو حاصل ہونے والی ہے۔ لشکر نے نعرۂ تکبیر وتہلیل بلند کرنا اور دعائیں کرنی شروع کر دیں۔ علمائے کرام مجاہدین کی صفوں میں پھیل گئے تاکہ ان کے ساتھ جہاد وقتال میں شریک ہوں۔ اس سے لشکر کی ہمت اور بڑھی اور ہر مجاہد اپنا فرض ادا کرنے کے لیے جنگ شروع ہونے کا بے صبری سے انتظار کرنے لگا۔

اگلے دن سلطان نے بری فوج کو شہر کی بیرونی فصیلوں کے سامنے مختلف مقامات پر متعین کر دیا۔ اس نے لشکر کے تین بڑے حصے تشکیل دیے جنھوں نے مختلف سمتوں سے سختی سے محاصرہ کر لیا۔ سلطان فاتح نے ان

بڑی فوجوں کے پیچھے احتیاطی فوج (ریزروفورس) متعین کی۔ اس نے فصیلوں کے سامنے توپیں نصب کر دیں جن میں سب سے اہم دیوہیکل ''سلطانی توپ'' تھی جو توپ قاپی گیٹ کے سامنے نصب کی گئی۔ اس کے علاوہ اس نے شہر کے قریب مختلف بلند مقامات پر نگران دستے متعین کیے۔ اسی دوران میں عثمانی جہاز ان سمندروں میں پھیل گئے جو شہر کو گھیرے ہوئے تھے۔ شروع میں انھیں ''گولڈن ہارن'' تک پہنچنے میں ناکامی ہوئی کیونکہ وہاں بہت بڑی زنجیر کسی بھی جہاز کے آگے بڑھنے میں رکاوٹ تھی بلکہ ہر وہ جہاز جو اس کے قریب آتا، اسے توڑ پھوڑ دیتی تھی، البتہ عثمانی جہازوں نے بحیرۂ مرمرہ میں امراء کے جزیروں پر قبضہ کر لیا۔[1]

اس دوران میں شاہ قسطنطین یازدہم کی قیادت میں بازنطینی سپاہی فصیل پر ہر جگہ پہنچ چکے تھے۔ وہ شہر کو محفوظ بنانے اور اس کا دفاع کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے۔ عثمانی لشکر نے محاصرہ سخت کر دیا۔ محاصرے کے ابتدائی ایام ہی سے حملہ آور فوج اور دفاع کرنے والی فوج میں مختلف جھڑپیں ہو رہی تھیں۔ عثمانی لشکر کے وہ افراد جنھیں دروازوں کے قریب کی ذمہ داری دی گئی تھی، ان میں سے بڑی تعداد جامِ شہادت نوش کر چکی تھی۔ اس دوران میں عثمانی توپ خانہ مختلف مقامات سے شہر پر گولہ باری کر رہا تھا۔ اس کے گولوں

[1] تاریخ الدولة العثمانية:133، و محمد الفاتح:98، و العثمانيون و البلقان:89.

مسجد ایا صوفیہ جو فتح قسطنطنیہ سے پہلے سینٹ صوفیہ گرجا تھا (استنبول)

اور خوف ناک آوازوں سے شہر کے اندر بازنطینیوں کے دل دہل رہے تھے۔ شہر کے گرد کی فصیل بعض جگہ سے ٹوٹ گئی لیکن دفاع کرنے والوں نے اس کی حفاظت کے لیے فوری کارروائی کی اور اس کی مرمت کر لی۔ اس کے علاوہ یورپ سے کچھ امدادی افواج آ گئیں جنھوں نے اس مشکل وقت میں شہر والوں کی مدد کی۔ ان میں جنوبی فوج پانچ جہازوں پر مشتمل تھی جن کا سردار جنوا (اٹلی) سے آنے والا کمانڈر جسٹینانی تھا۔ اس کے ماتحت یورپ کے مختلف ممالک سے آنے والے سات سو رضا کار جنگجو تھے۔ ان کے جہازوں نے شہر کا محاصرہ کرنے والے عثمانی جہازوں کا مقابلہ کیا اور قسطنطنیہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس سے بازنطینیوں کی ہمت بڑھ گئی اور اس کے کمانڈر جسٹینانی کو شہر کی دفاع کرنے والی افواج کا کمانڈر مقرر کر دیا گیا کیونکہ وہ شجاعت اور ذہانت میں نمایاں مقام رکھتا تھا۔ [1]

عثمانی بحری افواج نے اس موٹی آہنی زنجیر سے پار گزرنے کی کوشش کی جو گولڈن ہارن میں داخل ہونے کی جگہ لگی ہوئی تھی تاکہ مسلمانوں کے جہاز وہاں پہنچ سکیں۔ انھوں نے وہاں موجود بازنطینی اور یورپی جہازوں پر تیر برسائے لیکن شروع میں وہ اپنا ہدف حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اس وجہ سے شہر کا دفاع کرنے والوں کا حوصلہ بلند ہو گیا۔ عیسائیوں کے پادری اور راہب شہر میں گشت کرتے تھے اور دفاع

[1] تاريخ الدولة العثمانية: 134، و محمد الفاتح: 102، و العثمانيون و البلقان: 92، و فتح القسطنطينية: 71.

کرنے والوں کو ثابت قدمی اور صبر کی تلقین کرتے تھے۔ وہ عوام سے کہتے تھے کہ گرجا گھروں میں جا کر مسیح علیہ السلام اور کنواری مریم (علیہا السلام) سے شہر کی نجات کے لیے دعائیں کریں۔ بادشاہ قسطنطین بذاتِ خود اس غرض سے ایا صوفیا کے گرجا میں جاتا رہتا تھا۔ [1]

دونوں فریق اپنی اپنی جگہ ڈٹے ہوئے تھے۔ ایک طرف شہر پر حملہ کرنے والے تھے جن کا قائد محمد الفاتح تھا، دوسری طرف شہر کا دفاع کرنے والے تھے جن کی قیادت قسطنطین یا زدہم کر رہا تھا۔ اس نے سلطان کو کئی طرح کی اشیاء پیش کی تھیں تاکہ مال یا اطاعت کے عوض پسپائی اختیار کر لے۔ اس نے مزید قیمتی اشیاء کی بھی پیشکش کی لیکن سلطان فاتح رحمہ اللہ جواب میں شہر کو صلح کے ساتھ (جنگ کے بغیر) مسلمانوں کے سپرد کرنے کا مطالبہ کرتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اس صورت میں کوئی بھی شہر کے باشندوں یا عبادت خانوں کو بالکل نقصان نہیں پہنچائے گا۔ اس نے خط میں لکھا: ''تمھارا بادشاہ قسطنطنیہ کا شہر میرے حوالے کر دے۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ میرا لشکر کسی کی جان، مال یا آبرو پر ہاتھ نہیں ڈالے گا، پھر جو چاہے شہر میں مقیم رہے، وہ وہاں امن اور سلامتی سے رہے گا اور جو شخص چاہے اپنی پسند کے کسی مقام کی طرف چلا جائے۔ اس صورت میں بھی وہ امن اور سلامتی سے کوچ کرے گا۔'' [2]

محاصرہ اب بھی نامکمل تھا کیونکہ گولڈن ہارن کی آبنائے ابھی تک دشمن کے قبضے میں تھی۔ اس کے باوجود عثمانی حملہ بلا توقف اور مسلسل جاری تھا۔ ینی چری فوج نے عجیب شجاعت اور بے مثال جرأت کا مظاہرہ کیا۔ وہ بے جھجک موت کی طرف بڑھتے تھے اور توپ کے گولوں کے عقب میں حملہ کرتے تھے۔ اٹھارہ اپریل کو عثمانی توپیں بازنطینی فصیلوں کے مغربی حصے میں لیکوس ندی کے قریب شگاف ڈالنے میں کامیاب ہوگئیں۔ عثمانی لشکر کے سپاہی شگاف سے شہر میں داخل ہونے کے لیے بڑی بہادری سے اس کی طرف امڈ پڑے لیکن شہر کا دفاع کرنے والوں نے جسٹینانی کی قیادت میں شگاف اور دیوار کی حفاظت کے لیے جانیں لڑا دیں۔ فریقین میں شدید جنگ ہوئی۔ شگاف تنگ تھا۔ مسلمانوں پر تیروں اور گولوں کی بارش کثرت سے ہو رہی تھی۔ جگہ کی تنگی، دشمن کی طرف سے شدید مدافعت اور اندھیرا چھا جانے کی وجہ سے سلطان فاتح نے حملہ آور فوج کو واپسی کا حکم دے دیا لیکن وہ اپنے دشمنوں کو مرعوب کر چکے تھے اور حملہ کرنے کے لیے دوسرے موقع کی تلاش میں تھے۔ [3]

---

[1] تاريخ الدولة العثمانية: 134، و محمد الفاتح: 100. [2] عبدالسلام فہمی کی ''محمد الفاتح'': 92۔ [3] تاريخ الدولة العثمانية: 136، و محمد الفاتح: 123.

اسی روز عثمانی فوج کے جہازوں نے رکاوٹ ڈالنے والی زنجیر توڑ کر گولڈن ہارن میں داخل ہونے کی کوشش کی لیکن خلیج میں داخل ہونے کے راستے پر بازنطینی اور یورپی مشترکہ بحری بیڑے کے علاوہ زنجیر کے پیچھے دفاعی دستے موجود تھے۔ ان سب نے مل کر کوشش کی اور اسلامی جہازوں کو روک دیا اور بعض جہاز تباہ کر دیے۔ اس وجہ سے مسلمانوں کی بحری فوج کے بہت سے مجاہد شہید ہو گئے۔ باقی جہاز اپنا ہدف حاصل کرنے میں ناکام ہو کر واپس آنے پر مجبور ہو گئے۔

اس معرکے سے دو دن بعد عثمانی بحریہ اور بعض یورپی جہازوں کے درمیان ایک اور جنگ ہوئی جنھوں نے خلیج تک پہنچنے کی کوشش کی تھی۔ مسلمانوں کے جہازوں نے انھیں روکنے کی سرتوڑ کوشش کی۔ فاتح خود ساحل سے معرکے کی نگرانی کر رہا تھا لیکن یورپی جہاز اپنے ہدف تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے اور عثمانی جہاز انھیں روک نہ سکے۔ سلطان فاتح سخت غضب ناک ہوا اور اس نے بحری بیڑے کے کمانڈر کو معزول کر دیا۔[1]

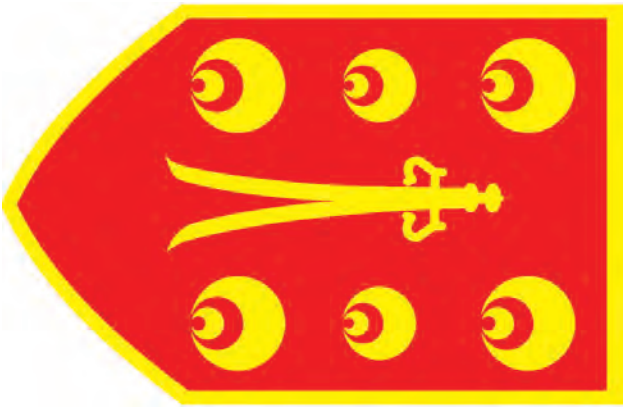

عثمانی پرچم

ان شکستوں کی وجہ سے سلطان کے بعض مشیروں نے جن میں اس کا وزیر خلیل پاشا سرفہرست تھا، کوشش کی کہ سلطان قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے کا ارادہ ترک کر دے اور وہاں کے باشندوں سے صلح کر کے محاصرہ ختم کر دے لیکن سلطان فتح کی کوشش جاری رکھنے پر مصر تھا۔ اس نے مختلف مقامات سے شہر کی دفاعی دیواروں پر توپوں سے گولہ باری جاری رکھی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ سنجیدگی سے غور و فکر کر رہا تھا کہ مسلمانوں کے جہازوں کو گولڈن ہارن میں کس طرح داخل کیا جائے۔ اس کی سوچ یہ تھی کہ گولڈن ہارن کی سمت کی فصیلیں اتنی مضبوط نہیں، لہٰذا بازنطینیوں کو ان کے دفاع کے لیے کچھ فوجیں شہر کی مغربی دیواروں سے ہٹانا پڑیں گی۔ دفاع کرنے والی فوجوں کے اس طرح تقسیم ہو جانے کی وجہ سے دیواروں پر حملہ کرنے

---

[1] تاريخ الدولة العثمانية: 134، و محمد الفاتح: 97، و مواقف حاسمة: 180.

کا زیادہ موقع ملے گا کیونکہ ان کا دفاع کرنے والوں کی تعداد کم ہو جائے گی۔

آخر سلطان فاتح کو ایک طریقہ سوجھ گیا جس سے وہ بازنطینی بحریہ سے الجھے بغیر گولڈن ہارن کو بند کرنے والی زنجیر سے بچ کر اپنی بحری فوجیں اس سمندر تک پہنچا سکتا تھا۔ طریقہ یہ تھا کہ عثمانی بحریہ کے جہازوں کو خشکی پر سے کھینچ کر لایا جائے حتی کہ وہ خلیج گولڈن ہارن اور دوسرے دفاعی انتظامات کو بائی پاس کر جائیں، پھر انھیں سمندر میں اتار دیا جائے۔ فاتح اور اس کے جنگی ماہرین نے اس پر غور کیا اور معلوم کیا کہ اس منصوبے پر عمل کرنے کے لیے کس کس سامان کی ضرورت ہوگی۔ ان جہازوں کو خشکی پر کس راستے سے گزارا جائے گا۔ مجوزہ منصوبے کا فاصلہ تین میل تھا۔ منصوبے کی جزئیات باریک بینی سے طے کرنے کے بعد فاتح کو اطمینان ہوگیا کہ یہ منصوبہ قابل عمل ہے۔ اسے عملی جامہ پہنانے والے ماہرین نے بھی اس کی حوصلہ افزائی کی۔ راستہ تیار کرنے اور ہموار کرنے کا کام خاموشی سے شروع ہوگیا۔ بازنطینی سمجھ نہ سکے کہ اس کام کا مقصد کیا ہے۔ کثیر مقدار میں لکڑی کے تختے اور چربی جمع کر لی گئی۔ ضروری سامان پورا ہو جانے کے بعد فاتح نے اکیس اپریل کی شام کو اپنی فوج کو حکم دیا کہ بازنطینیوں کو مشغول رکھنے کے لیے گولڈن ہارن میں آہنی زنجیر کو پار کرنے کی کوشش جاری رکھی جائے۔ تمام بازنطینی فوجیں اس طرف جمع ہوگئیں۔ انھیں معلوم نہ ہوا کہ دوسری طرف کیا ہو رہا ہے۔ سلطان نے تیار شدہ راستے پر لکڑی کے تختے بچھانے کا کام جاری رکھا، پھر ان تختوں کو چربی سے چکنا کیا گیا۔ جہازوں کو باسفورس سے کھینچ کر خشکی پر لایا گیا۔ انھیں تین میل تک ان چکنے تختوں پر کھینچ کر لے جایا گیا حتی کہ وہ ایک محفوظ مقام پر پہنچ گئے اور وہاں سے گولڈن ہارن میں اتر گئے۔ عثمانیوں نے اس رات ستر سے زیادہ جہاز کھینچ کر وہاں پہنچا دیے جبکہ دشمن اس سے بے خبر رہا اور ایسے طریقے سے پہنچائے گئے کہ سلطان فاتح سے پہلے کسی نے یہ طریقہ اختیار نہیں کیا تھا۔ اس نے بذاتِ خود اس جہادی آپریشن کی نگرانی کی جو رات کی تاریکی میں دشمن کی نظروں سے اور اس کی نگرانی سے بچ کر عمل میں لایا گیا۔ بائیس اپریل کی صبح ہوئی تو شہر والوں کی آنکھیں تب کھلیں جب انھوں نے گولڈن ہارن میں عثمانیوں کی آوازیں سنیں۔ وہ تکبیر کے نعرے لگا رہے تھے اور ترکی ترانے گا رہے تھے۔ عیسائی یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ عثمانی جہاز اس آبی گزرگاہ پر قابض ہو گئے ہیں۔ اب قسطنطنیہ کا دفاع کرنے والوں اور عثمانی فوجوں کے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں رہی تھی۔ [1]

---

[1] تاريخ سلاطين آل عثمان للقرماني: 26، و تاريخ الدولة العثمانية: 134، و محمد الفاتح: 105، و العثمانيون في التاريخ: 72، و تاريخ سلاطين آل عثمان ليوسف آصاف: 58.

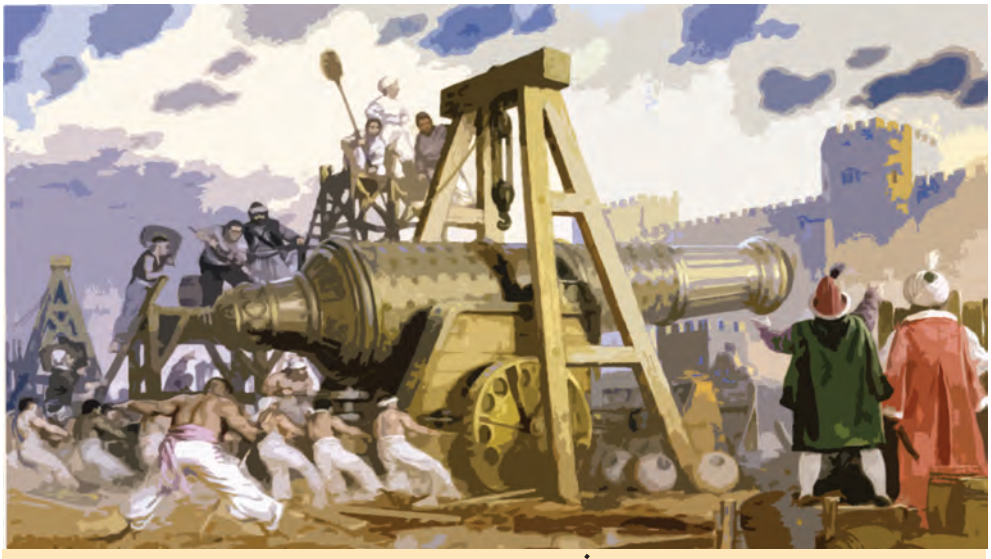

قسطنطنیہ کی فصیل پر فائرنگ کرتی عثمانی توپ

ایک بازنطینی مؤرخ نے اس عمل پر اس طرح تعجب کا اظہار کیا ہے: ''ایسا معجزانہ کارنامہ ہم نے اس سے پہلے نہ دیکھا، نہ سنا۔ محمد فاتح نے خشکی کو سمندر بنا ڈالا۔ اس کے جہازوں نے پانی کی لہروں کے بجائے پہاڑوں کی چوٹیوں پر سفر کیا۔ یہ کام کر کے محمد ثانی نے سکندر اعظم کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔'' [1]

قسطنطنیہ والے مایوس ہونے لگے۔ ان میں افواہیں اور پیشگوئیاں کثرت سے گردش کرنے لگیں۔ ایک پیشگوئی یہ مشہور ہوئی: ''قسطنطنیہ اس وقت شکست کھائے گا، جب خشکی پر جہاز چلتے دیکھے گا۔'' شہر کا دفاع کرنے والوں کی کمر ہمت ٹوٹنے میں گولڈن ہارن میں مسلمانوں کے جہازوں کی موجودگی کا بہت بڑا حصہ تھا۔ انھیں دوسری فصیلوں کی حفاظت کرنے والی افواج میں سے بڑی تعداد کو وہاں سے ہٹانا پڑا تاکہ گولڈن ہارن کی فصیل کا دفاع کر سکیں۔ یہ فصیل سب سے کمزور تھی کیونکہ ماضی میں اس کی حفاظت کے لیے سمندر ہی کافی ہوتا تھا۔ اس طرح دوسری فصیلوں کے دفاع میں خلل واقع ہو گیا۔ [2]

بازنطینی بادشاہ نے کوشش کی کہ گولڈن ہارن میں موجود جہازوں پر زیادہ منظم طریقے سے شب خون مارا جائے اور انھیں غرق کرنے یا تباہ کرنے کی جان توڑ کوشش کی جائے لیکن عثمانی بیڑا حملہ آوروں کی گھات میں تھا، چنانچہ یہ حربہ ناکام ہو گیا۔ [3]

---

[1] تاريخ الدولة العثمانية: 135. [2] محمد الفاتح: 106. [3] محمد الفاتح لعبد السلام فهمي: 104، و محمد الفاتح لسالم الرشيدي: 107.

عثمانیوں نے شہر پر گولہ باری کرنے اور فصیل توڑنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ وہ فصیلوں پر چڑھنے کی بھی کوشش کر رہے تھے جبکہ دفاع کرنے والے اپنے شہر کی ٹوٹنے والی دیواروں کی تعمیر اور مرمت میں مشغول تھے۔ محاصرہ مسلسل جاری رہنے کے ساتھ ساتھ ترکوں کی دیواروں پر چڑھنے کی بار بار کوششوں کو روکنے میں دنوں کے علاوہ راتوں کو بھی مصروف رہنے کی وجہ سے وہ تھک کر چور ہو گئے اور ان پر مایوسی غالب آنے لگی۔ عثمانیوں نے باسفورس اور گولڈن ہارن کے قریبی ٹیلوں پر خاص توپیں نصب کر رکھی تھیں جن کے ذمہ گولڈن ہارن میں اور قریبی سمندر میں بازنطینی جہازوں اور ان سے تعاون کرنے والے جہازوں پر گولہ باری کرنا تھا۔ ان کی وجہ سے دشمن کے جہازوں کی نقل وحرکت مکمل طور پر منجمد ہو کر رہ گئی۔ بادشاہ قسطنطین نے اپنے معاونوں، مشیروں اور عیسائی پادریوں کا ایک اجلاس بلا لیا۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ بادشاہ خود شہر سے نکل کر یورپ میں اور قریبی عیسائی ریاستوں میں جا کر مدد طلب کرے۔ ہوسکتا ہے اس کے نتیجے میں سلطان فاتح خوف زدہ ہو کر شہر کا محاصرہ اٹھا لے۔ بادشاہ نے یہ رائے قبول نہ کی اور کہا کہ وہ شہر میں اپنی قوم کے ساتھ رہے گا اور جو انجام قوم کا ہوگا، وہی اس کا بھی ہوگا۔ اس نے کہا: اس چیز کو فرار سمجھا جائے گا۔ آیندہ میرے سامنے اس قسم کی کوئی تجویز پیش نہ کی جائے۔ البتہ اس نے مدد کے حصول کے لیے یورپ کے اطراف واکناف میں اپنے نمائندہ وفود بھیجنے پر اکتفا کیا۔[1]

محاصرے کے اگلے مرحلے میں عثمانیوں نے شہر میں داخل ہونے کے لیے ایک نیا اور اچھوتا طریقہ اختیار کیا۔ انھوں نے کئی جگہ سے اندرونِ شہر کی طرف زیر زمین سرنگیں کھودنی شروع کر دیں۔ شہر والوں نے سولہ مئی کو زمین کے نیچے سخت ضربوں کی آوازیں سنیں جو آہستہ آہستہ اندرونِ شہر کے قریب آ رہی تھیں۔ بادشاہ اپنے کمانڈروں اور مشیروں کے ساتھ آواز کی طرف گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ عثمانی لشکر شہر میں داخل ہونے کے لیے زمین کے نیچے سرنگیں کھود رہا ہے۔ دفاع کرنے والوں نے ان کا مقابلہ کرنے کے لیے ویسی ہی سرنگیں اس طرح کھودنے کا فیصلہ کیا کہ حملہ آور فوج کو معلوم نہ ہو سکے۔ جب حملہ آور ان سرنگوں تک پہنچے تو انھوں نے سمجھا کہ وہ خفیہ مخصوص راستوں تک پہنچ گئے ہیں جن کے ذریعے سے وہ اندرون شہر تک پہنچ جائیں گے۔ یہ سوچ کر وہ خوش ہو گئے لیکن یہ خوشی دیرپا ثابت نہ ہوئی کیونکہ رومیوں نے ان پر اچانک آگ کے شعلے، جلتا ہوا مٹی کا تیل اور بھڑکنے والی چیزیں پھینکنی شروع کر دیں۔ اس کے نتیجے میں

---

[1] محمد الفاتح: 116، و فتح القسطنطينية: 97.

سلطان محمد فاتح اپنے لشکر کے ہمراہ شاخ زریں کے کنارے

بہت سے مجاہد (دھوئیں سے) دم گھٹ جانے کی وجہ سے شہید ہوگئے۔ بہت سے آگ میں جل کر شہید ہوگئے اور جو بچے، وہ پلٹ گئے۔ [1]

اگرچہ یہ منصوبہ کامیاب نہیں رہا تھا، تاہم عثمانیوں کو بعض دوسری سرنگوں کی طرف سے کامیابی کی امید تھی۔ اس لیے شہر فتح ہونے تک وہ مختلف نئی جگہوں سے سرنگیں کھودتے رہے۔ کھدائی کے اس عمل سے شہر کا دفاع کرنے والوں کے دلوں میں بے حد خوف پیدا ہوگیا۔ وہ شہر کے نیچے سے کسی بھی وقت، کسی بھی جگہ سے، عثمانیوں کے نکل آنے کی توقع کر سکتے تھے۔ کئی جگہ انھیں شک ہوا کہ نیچے کھدائی ہو رہی ہے۔ وہ وہاں جمع ہوکر مقابلے کی تیاری کرتے رہے لیکن اس کی کبھی نوبت نہ آئی۔

عثمانیوں نے شہر میں داخل ہونے کی کوشش میں ایک نیا طریقہ اختیار کیا۔ انھوں نے لکڑی کا ایک بہت بڑا متحرک قلعہ تیار کیا جس کی تین منزلیں تھیں اور وہ فصیلوں سے زیادہ بلند تھا۔ اسے بھیگے ہوئے چمڑے اور زرہوں سے ڈھانپا گیا تھا تاکہ اس پر آگ اثر نہ کرے۔ اس متحرک قلعے کی ہر منزل میں مجاہدین تھے۔ اس کی بالائی منزل پر تیرانداز تھے۔ جب بھی کوئی شخص فصیل کے اوپر سے سر نکال کر جھانکنے کی کوشش کرتا، تیرانداز اس پر تیر چلا دیتے۔ تب ترکوں نے اس متحرک قلعے کے ذریعے سے پیش قدمی کی اور باب رومانوس

[1] تاريخ الدولة العثمانية: 16، و محمد الفاتح: 113، و فتح القسطنطينية: 98.

کے قریب فصیل کے نزدیک پہنچ گئے تو شہر کا دفاع کرنے والوں پر اس کا رعب پڑ گیا۔ بادشاہ خود اپنے کمانڈروں سمیت وہاں پہنچا تا کہ متحرک قلعے کو آگے بڑھنے سے روک کر دیوار سے دور ہٹا دیا جائے لیکن عثمانی اسے فصیل کے ساتھ ملا دینے میں کامیاب ہوگئے۔ تب متحرک قلعہ والوں اور شہر کا دفاع کرنے والوں میں زور دار جنگ ہوئی۔ متحرک قلعے میں سے بعض افراد نے فصیل پر چڑھنے کی کوشش کی اور وہ اس کوشش میں کامیاب ہوگئے۔ بادشاہ مایوس ہوگیا۔ اسے یقین ہوگیا کہ اب شکست ہو جائے گی لیکن دفاع کرنے والوں نے متحرک قلعے پر کثرت سے آگ برسائی حتی کہ لکڑی کے اس قلعے پر آگ کا اثر ہونے لگا۔ وہ جل کر بازنطینیوں کے قریبی برجوں پر جا گرا اور ان میں موجود دفاعی فوجی جل کر شہید ہو گئے اور اس کی قریبی خندق مٹی اور پتھروں سے بھر گئی۔ اس کے باوجود عثمانی مایوس نہ ہوئے۔ سلطان فاتح نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور فرمایا: ''کل ہم چار مزید قلعے بنائیں گے۔''[1]

محاصرہ طویل اور مزید سخت ہوگیا۔ شہر کے اندر موجود بازنطینی تنگ آ گئے۔ تب شہر کے لیڈروں نے 24 مئی کو شاہی محل کے اندر اور بادشاہ کی موجودگی میں میٹنگ کی۔ اجتماع کے شرکاء شہر کے بچاؤ سے ناامید نظر آ رہے تھے۔ بادشاہ کو تجویز پیش کی گئی کہ شہر پر محاصرین کا قبضہ ہونے سے پہلے بادشاہ کو خود شہر سے نکل جانا چاہیے تا کہ وہ شہر کو بچانے کے لیے یا شہر کے ہاتھ سے نکل جانے کی صورت میں اسے دوبارہ حاصل کرنے کے لیے مدد حاصل کرنے کی کوشش کر سکے لیکن بادشاہ نے ایک بار پھر یہ تجویز رد کر دی اور شہر میں موجود رہنے، نیز دفاع کرنے والوں کی قیادت کرتے رہنے پر اصرار کیا۔ وہ فصیلوں کے حفاظتی اقدامات کا جائزہ لینے کے لیے باہر آ گیا۔

شہر میں بدشگونی اور افواہیں گردش کرنے لگیں۔ اس سے دفاع کرنے والوں کی ہمت پست ہوگئی۔ سب سے شدید بدشگونی کا باعث وہ واقعہ تھا جو 16 جمادی الاولیٰ مطابق 25 مئی کو پیش آیا۔ ہوا یہ کہ شہر والوں نے سیدہ مریم علیہا السلام کا مجسمہ اٹھا کر شہر کے مختلف حصوں میں جلوس نکالا۔ وہ سیدہ مریم عذرا علیہا السلام سے دعائیں کر رہے تھے اور اس کے سامنے آہ وزاری کر رہے تھے کہ وہ انھیں اس مصیبت سے نجات دے۔ اچانک مجسمہ ان کے ہاتھوں سے گر پڑا اور ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ اس واقعے کو انھوں نے نحوست کا اشارہ سمجھا۔ اس سے شہر کے تمام باشندوں پر، بالخصوص دفاع کرنے والوں پر بہت اثر پڑا۔

---

[1] عبدالسلام فہمی کی محمد الفاتح: 112، نیز دیکھیے: سالم الرشیدی کی محمد الفاتح: 115.

اگلے دن 26 مئی کو شدید بارش ہوئی جس کے ساتھ کڑک اور گرج بھی تھی۔ اس کے علاوہ ایا صوفیا کے گرجے پر بجلی گر پڑی۔ لاٹ پادری نے اسے بھی نحوست کا اشارہ سمجھا۔ اس نے جا کر بادشاہ کو بتایا کہ خدا نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا ہے اور یہ شہر عثمانی مجاہدین کے قبضے میں چلا جائے گا۔ بادشاہ پر اس کا اتنا شدید اثر ہوا کہ وہ بے ہوش ہو گیا۔ [1]

عثمانی توپ خانہ اپنا کام کر رہا تھا اور فصیلوں اور قلعہ بندیوں کو توڑ رہا تھا۔ فصیل اور برجوں کے بہت سے حصے منہدم ہو گئے۔ خندقیں ان کے ملبے سے بھر گئیں۔ دفاع کرنے والے اسے اٹھاتے اٹھاتے تھک گئے اور محسوس ہونے لگا کہ حملہ آور فوج کسی بھی لمحے شہر میں داخل ہو سکتی ہے، البتہ ابھی داخلے کے وقت کا تعین نہیں ہوا تھا۔ سلطان فاتح نے شہر کے نقشے پر اور داخل ہونے کے مقامات پر غور و فکر کیا اور دفاع کرنے والوں کی حالت کا جائزہ لیا تو اسے معلوم ہوا کہ شہر فتح ہونے کے قریب ہے۔ اس کے باوجود اس نے کوشش کی کہ وہ امن کے ساتھ داخل ہو، چنانچہ اس نے بادشاہ کو خط لکھا کہ شہر خوں ریزی کے بغیر اس کے حوالے کر دے۔ اس نے پیشکش کی کہ بادشاہ کو اس کے خاندان اور ملازموں سمیت سلامتی کے ساتھ نکل جانے کی ضمانت دی جائے گی۔ شہر کے دیگر باشندوں میں سے بھی جو شخص جانا چاہے، جہاں چاہے، امن کے ساتھ چلا جائے۔ [2]

سلطان فاتح نے لکھا کہ شہر کے لوگوں کی جانیں محفوظ ہوں گی۔ انھیں کسی قسم کی تکلیف نہیں دی جائے گی۔ انھیں اختیار ہوگا کہ شہر میں رہیں یا کوچ کر جائیں۔ جب یہ خط بادشاہ کو ملا تو اس نے اپنے مشیروں کو جمع کیا اور صورتِ حال ان کے سامنے رکھی۔ بعض درباری شہر سے دست بردار ہونے کی طرف میلان رکھتے تھے لیکن دوسروں نے موت تک شہر کا دفاع جاری رکھنے پر اصرار کیا۔ بادشاہ کا میلان بھی ان افراد کی رائے کی طرف ہو گیا جو آخری لمحے تک جنگ جاری رکھنے کے خواہش مند تھے، چنانچہ بادشاہ نے سلطان فاتح کے ایلچی کو جواب میں ایک خط دیا: جس میں اس نے لکھا کہ وہ خدا کا شکر ادا کرتا ہے کہ سلطان صلح کی طرف مائل ہوا ہے اور وہ اس بات پر راضی ہے کہ سلطان اسے جزیہ ادا کرے۔ باقی رہا قسطنطنیہ تو اس نے قسم کھائی ہے کہ وہ زندگی کی آخری سانس تک اس کا دفاع کرے گا، پھر یا اپنا تخت بچا لے گا یا اس کی دیواروں تلے دفن ہو جائے گا۔'' جب فاتح کو خط ملا تو اس نے کہا: ''اچھا، عنقریب قسطنطنیہ میں میرا تخت ہوگا یا اس میں میری قبر ہوگی۔'' [3]

---

[1] محمد الفاتح: 118، و فتح القسطنطينية: 97. [2] تاريخ الدولة العلية: 164، و محمد الفاتح: 119، و فتح القسطنطينية: 102. [3] محمد الفاتح: 116، 119.

فتح قسطنطنیہ کے موقع پر عثمانی لشکر

جب سلطان صلح کے ساتھ شہر مل جانے سے مایوس ہوگیا تو اس نے حملے کی شدت میں اضافہ کر دیا۔ خاص طور پر توپوں سے شہر پر گولہ باری زیادہ کر دی حتی کہ دیوہیکل سلطانی توپ کثرتِ استعمال سے پھٹ گئی اور اسے چلانے والے شہید ہوگئے جن میں سب سے نمایاں فرد ہنگری کا انجینئر ''اربان'' بھی شامل تھا۔توپ اسی کی نگرانی میں تیار ہوئی تھی۔ سلطان نے حکم دیا کہ توپ کو زیتون کے تیل کے ذریعے سے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی جائے۔ ماہرین کی کوشش کامیاب ہوئی اور توپیں دوبارہ شہر پر گولہ باری کرنے لگیں بلکہ گولے ایسے رخ پھینکے جانے لگے کہ وہ شہر کے درمیان میں گرتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ برجوں اور فصیلوں پر بھی گولہ باری جاری رہی۔ اس وقت عثمانیوں کی صفوں میں یہ افواہ گردش کرنے لگی کہ شہر والوں کی مدد کے لیے یورپ سے عیسائی فوجیں روانہ ہو چکی ہیں۔ سلطان فاتح نے فوراً اجلاس طلب کر لیا جس میں اس کے مشیروں اور بڑے کمانڈروں کے علاوہ علماء بھی شامل تھے۔ فاتح نے حاضرین سے کہا کہ اپنی اپنی رائے کھل کر اور بلاتردد پیش کریں۔بعض نے پسپائی کا مشورہ دیا جن میں وزیر خلیل پاشا بھی شامل تھا، اس نے کہا: ہمیں خون بہانے کے بجائے پیچھے ہٹ جانا چاہیے اور سوچنا چاہیے کہ شہر پر مسلمانوں کا قبضہ ہو جانے کی صورت میں عیسائی یورپ کے غیظ وغضب کا کیا حال ہوگا۔ اس نے اس طرح اور عذر بھی پیش کیے۔ اس شخص کے بارے میں پہلے بھی یہی سمجھا جاتا تھا کہ وہ بازنطینیوں سے ساز باز رکھتا ہے

معرکۂ قسطنطنیہ کا ایک منظر

اور ان کے مخالفین کی حوصلہ شکنی کرنا چاہتا ہے۔ [1]

بعض حاضرین نے سلطان کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا کہ شہر فتح ہونے تک حملہ جاری رکھنا چاہیے۔ واپسی کی صورت میں جہاد کے جذبات سرد پڑ جائیں گے۔ ان میں ایک بہادر کمانڈر ''زوغنوس پاشا'' بھی شامل تھا۔ یہ البانوی نسل کا ایک نومسلم تھا جو پہلے عیسائی تھا۔ اس نے سلطان کو یقین دلایا کہ یورپی افواج کی حالت پتلی ہے۔ [2]

علماء نے بھی اس رائے کی تائید کی اور سلطان بھی خوش ہوا کیونکہ خود اس کی خواہش بھی یہی تھی کہ فتح حاصل ہونے تک جنگ جاری رکھی جائے۔ اجلاس ختم ہونے سے پہلے سلطان نے بتایا کہ عام حملے اور شہر میں داخل ہونے کے بارے میں ہدایات جلد جاری کر دی جائیں گی۔

اتوار 18 جمادی الاولیٰ مطابق 27 مئی کو سلطان نے لشکر کو ہدایات جاری کیں کہ دلوں کو پاک کر کے

---

[1] تاريخ الدولة العثمانية: 134، و فتح القسطنطينية: 103، و محمد الفاتح: 104. [2] محمد الفاتح: 104، و فتح القسطنطينية: 104، و تاريخ الدولة العثمانية: 134.

نمازوں، نیک اعمال اور دعاؤں کے ذریعے سے اللہ کا قرب حاصل کریں تاکہ اللہ تعالیٰ فتح آسان فرما دے۔ یہ حکم مسلمانوں کی فوج میں ہر ایک تک پہنچ گیا۔ اس دن سلطان نے خود بھی شہر کی فصیلوں کا معاینہ کیا اور دیکھا کہ مختلف مقامات پر دفاع کرنے والوں کی کیا پوزیشن ہے۔ سلطان نے خاص مقامات متعین کر دیے جہاں سے گولہ باری جم کر کی جائے گی۔ اس نے لشکر کی چھاؤنیوں کا اچانک دورہ کیا اور مجاہدین کا حال معلوم کیا، نیز انھیں دشمن سے جنگ میں جانبازی اور قربانی کی تلقین کی۔

''قرامان'' کے باشندے غیر جانبدار تھے۔ سلطان نے انھیں پیغام بھیج کر تاکید کی کہ عنقریب پیش آنے والے واقعات میں مداخلت نہ کریں اور انھیں یقین دلایا کہ ان کے ساتھ کیے ہوئے وعدے پورے کیے جائیں گے۔ اس جنگ کے دوران میں ان کا جو نقصان ہوگا، اس کا معاوضہ دیا جائے گا۔ اس دن شام کو عثمانیوں نے اپنے پڑاؤ کے اردگرد بہت زیادہ آگ جلائی اور تکبیر و تہلیل کے زور دار نعرے بلند کیے حتیٰ کہ رومیوں نے خیال کیا کہ عثمانیوں کی لشکر گاہ میں آگ لگ گئی ہے۔ معلوم کرنے پر پتا چلا کہ عثمانی اپنی فتح کی پیشگی خوشی منا رہے ہیں۔ اس سے رومی مرعوب ہو گئے۔ اگلے دن 28 مئی کو عثمانیوں کی تیاری

عروج پر تھی۔ توپیں بازنطینیوں پر آگ اگل رہی تھیں۔ سلطان خود مختلف مقامات پر جا کر ان کے حالات معلوم کر رہا تھا، انھیں ہدایات دے رہا تھا اور خلوصِ نیت، دعا، قربانی اور جذبۂ جہاد کی یاد دہانی کرا رہا تھا۔ [1]

اس وقت بازنطینی بادشاہ بھی شہر میں عوام کو اجتماعی دعا کے لیے اکٹھا کر رہا تھا۔ مرد، عورتیں اور بچے گرجا گھروں میں جمع ہو کر نصرانی طریقے پر دعا اور گریہ زاری میں مشغول تھے کہ شاید ان کی دعا قبول ہو اور وہ اس محاصرے سے نجات پا جائیں۔ بادشاہ نے ایک فصیح و بلیغ تقریر کی جو اس کی زندگی کی آخری تقریر ثابت ہوئی۔ اس نے اس بات پر زور دیا کہ اگر وہ مر بھی جائے تو شہر کا دفاع جاری رکھا جائے اور عثمانی مسلمانوں کے مقابلے میں عیسائیت کے دفاع کے لیے جانیں قربان کر دی جائیں۔ مؤرخین کہتے ہیں کہ یہ بڑی زبردست تقریر تھی جس سے تمام حاضرین اشک بار ہو گئے۔ اس کے علاوہ بادشاہ اور اس کے ساتھ عیسائیوں نے ایاصوفیا کے گرجے میں آخری بار عبادت کی۔ ان کے نزدیک یہ مقدس ترین گرجا تھا۔ [2]

عین اس وقت دوسری طرف مسلمان علماء مجاہدین کو سورۃ الانفال میں سے جہاد کی آیات پڑھ کر سنا رہے تھے اور انھیں اللہ کی راہ میں شہادت کی فضیلت بتا رہے تھے۔ انھیں قسطنطنیہ کے پاس شہادت پانے والوں کی یاد دلا رہے تھے جن میں سیدنا ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سرفہرست ہیں، اور قسطنطنیہ کی دیواروں تلے شہادت پانے والے دوسرے شہداء کا تذکرہ کر رہے تھے۔

قسطنطنیہ فتح ہو گیا

29 مئی کی رات شہر اور اس کے گرد و نواح میں بارش ہوئی۔ مسلمان اس سے خیر کی امید رکھ کر خوش ہوئے۔ علمائے کرام نے انھیں یاد دلایا کہ جنگ بدر کے موقع پر بھی اسی طرح بارش ہوئی تھی۔ رومیوں کو امید ہوئی کہ تیز بارش سے مسلمانوں کی سرگرمیوں میں رکاوٹ پیدا ہو جائے گی لیکن ایسے نہ ہوا۔ بارش ہلکی رہی۔

منگل 20 جمادی الاولیٰ 857ھ مطابق 29 مئی 1453ء کو صبح ایک بجے فوج کو اشارہ دیا گیا اور عام حملہ شروع ہو گیا۔ مسلمان نعرۂ تکبیر لگاتے ہوئے فصیل کی طرف بڑھے۔ قسطنطنیہ والے گھبرا گئے اور کلیساؤں کی گھنٹیاں بجانے لگے۔ بہت سے لوگ بھاگ کر کلیساؤں میں چلے گئے۔ عثمانیوں نے طے شدہ منصوبے کے مطابق خشکی اور سمندر دونوں اطراف سے بیک وقت حملہ کیا۔ مجاہدین شہادت کے طلب گار تھے۔ بہت

---

[1] تاریخ الدولة العثمانية: 137، و محمد الفاتح: 124، و تاریخ الدولة العلية: 164. [2] تاریخ الدولة العثمانية: 137، عبدالسلام فہمی کی محمد الفاتح: 121، سالم الرشیدی کی محمد الفاتح: 129.

سلطان محمد فاتح قسطنطنیہ میں داخل ہوتے ہوئے

سے مسلمانوں نے پیش قدمی کرتے ہوئے بڑی بہادری اور قربانی کے جذبے سے جنگ کی اور شہادت سے ہمکنار ہوئے۔ حملے کو مختلف علاقوں میں تقسیم کیا گیا تھا لیکن اس کا سب سے زیادہ زور خود سلطان فاتح کی زیر قیادت ندی لیکوس کی جانب تھا۔ حملہ آوروں کی اگلی افواج فصیلوں پر اور ان کا دفاع کرنے والوں پر گولوں اور تیروں کی بارش کر رہی تھیں۔ ان کی کوشش تھی کہ شہر کی افواج نقل وحرکت کے قابل نہ رہیں۔

بوکولیون کے بازنطینی محل کے آثار
جن کو انگور کی بیلیں ڈھانکے ہوئے ہیں

دفاع کرنے والے بہادری سے ڈٹے ہوئے تھے اور حملہ آور بھی بہادری کا مظاہرہ کر رہے تھے، چنانچہ دونوں فوجوں کے سپاہی بڑی تعداد میں لقمۂ اجل بن رہے تھے۔ [1]

جب پہلے حملہ آور گروہ کو تھکاوٹ محسوس ہوئی، تب تک سلطان دوسرا گروہ تیار کر چکا تھا۔ اس نے پہلے گروہ کو پیچھے بلا کر دوسرا گروہ آگے کر دیا۔ دفاع کرنے والے بھی تھکن کا شکار تھے۔ نیا حملہ آور گروہ فصیل تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ انھوں نے شہر میں داخل ہونے کی کوشش کرتے ہوئے فصیل کے ساتھ سیکڑوں سیڑھیاں لگا دیں لیکن دفاع کرنے والوں نے سیڑھیاں الٹا دیں۔ حملہ آور فوج کی طرف سے جان توڑ کوشش جاری رہی۔ دفاع کرنے والے انھیں فصیل پر چڑھنے سے روکنے کے لیے پوری کوشش کر رہے تھے۔ دو گھنٹے کی جدوجہد کے بعد سلطان فاتح نے اپنی فوج کو آرام کرنے کے لیے پیچھے ہٹ آنے کا حکم دیا جبکہ وہ محاذِ جنگ کے اس حصے میں دفاع کرنے والوں کو عاجز کر چکے تھے۔ اسی وقت حملہ آوروں کے تیسرے گروہ کو فصیل کے اس حصے پر حملہ کرنے کا حکم دے دیا گیا۔ دفاع کرنے والے سمجھ رہے تھے کہ معاملہ ٹھنڈا ہو گیا لیکن اچانک حملہ آوروں کے تیسرے گروہ نے انھیں حیران کر دیا۔ وہ تھک کر چور ہو چکے تھے جبکہ حملہ آور تازہ دم اور تیار تھے۔ وہ آرام کر چکے تھے اور جہاد میں اپنا حصہ ڈالنے کے لیے بڑے شوق سے آئے تھے۔ سمندر کی طرف بھی لڑائی زوروں پر تھی۔ اس سے دفاع کرنے والوں کی قوت تقسیم ہوگئی۔ انھیں ایک ہی وقت میں ایک سے زیادہ محاذوں پر لڑنا پڑا۔ جب صبح کی روشنی نمودار ہوئی تو حملہ آور دشمن کے مقام کا بہتر اندازہ کرنے کے قابل ہوگئے۔ انھوں نے دگنی کوشش سے حملہ کر دیا، چنانچہ اس جگہ کا

---

[1] تاريخ الدولة العثمانية: 139، و محمد الفاتح: 131، و فتح القسطنطينية: 114.

دفاع کرنے کی ذمہ داری بادشاہ قسطنطین کو ذاتی طور پر خود اٹھانا پڑی۔ اس میں جسٹینانی جنوی بھی اس کے ساتھ شریک تھا۔ [1]

مسلمان حملے کو کامیاب بنانے کے لیے انتہائی پرجوش تھے۔ اس کے باوجود سلطان فاتح نے انھیں پیچھے ہٹنے کا حکم دے دیا تاکہ توپیں دوبارہ اپنا کام شروع کر سکیں۔ انھوں نے دفاع کرنے والوں پر گولوں کی بوچھاڑ کر دی اور انھیں مزید تھکا دیا جبکہ وہ رات بھر کے جاگے ہوئے تھے۔ جونہی توپیں خاموش ہوئیں، ینی چری سورماؤں کا نیا دستہ آ پہنچا۔ ان کی قیادت خود سلطان کر رہا تھا۔ حملہ آوروں کے تیروں نے ان پر سایہ کر لیا تاکہ دفاع کرنے والوں کو قدم جمانے کا موقع نہ ملے۔ ان حملوں میں ینی چری کی شجاعت بہت نمایاں تھی۔ ان میں سے تیس افراد بے مثال بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے فصیل پر چڑھ گئے جس سے دشمن بھی حیران رہ گئے۔ اگرچہ ان کی بڑی تعداد شہید ہوگئی جن میں ان کا کمانڈر بھی شامل تھا، تاہم وہ توپ قاپی کے نزدیک شہر میں داخل ہونے کا راستہ بنانے میں کامیاب ہوگئے اور انھوں نے عثمانی جھنڈے لہرا دیے۔ اس کے نتیجے میں باقی لشکر میں شہر میں داخل ہونے کا جوش بڑھ گیا اور دشمنوں کی ہمت پست ہوگئی۔ اس وقت دفاع کرنے والوں کے کمانڈر جسٹینانی کو جو بہادری میں ضرب المثل تھا، شدید زخم آ گیا جس کی وجہ سے اسے میدانِ جنگ سے ہٹنا پڑا۔ [2]

تب جسٹینانی کی جگہ بادشاہ قسطنطین نے خود دفاع کرنے والی فوج کی کمان سنبھالی جبکہ جسٹینانی ایک جہاز پر سوار ہو کر میدانِ جنگ سے فرار ہوگیا۔ بادشاہ نے بہت کوشش کی کہ دفاع کرنے والوں کے قدم مضبوط کرے جو محسوس کر رہے تھے کہ اب دفاع کا کوئی فائدہ نہیں، ان کے دلوں میں مایوسی گھر کر چکی تھی جبکہ خود سلطان کی قیادت میں حملہ شدید سے شدید تر ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ دفاع کرنے والوں کی ہمت ٹوٹنے سے فائدہ اٹھا لے۔

عثمانیوں نے شہر کی دوسری طرف سے دباؤ جاری رکھا حتی کہ وہ باب ادرنہ کی طرف سے فصیل کے اندر داخل ہو کر بعض برجوں پر قابض ہوگئے اور ان میں موجود دفاعی دستوں کو ختم کر کے ان پر عثمانیوں کے جھنڈے لہرا دیے۔ عثمانی لشکر اس خطے سے شہر میں گھس آئے۔ جب بازنطینی بادشاہ نے دیکھا کہ شہر کے

---

[1] تاريخ الدولة العثمانية: 139، و محمد الفاتح: 131، و فتح القسطنطنية: 113. [2] تاريخ الدولة العثمانية: 138، و محمد الفاتح: 135، و فتح القسطنطينية: 115.

بحیرۂ مرمرہ کے سامنے توپ کاپی محل (استنبول)

شمالی برجوں پر عثمانی جھنڈے لہرا رہے ہیں تو اسے یقین ہوگیا کہ اب دفاع کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس نے شاہی لباس اتار دیا تاکہ اسے کوئی نہ پہچانے اور گھوڑے سے اتر کر جنگ کرنے لگا حتی کہ میدانِ جنگ میں مارا گیا۔[1]

جب قسطنطین کے مرنے کی خبر عام ہوئی تو عثمانی مجاہدین کے جوش و جذبے میں اضافہ ہوگیا اور بازنطینی ہمت ہار بیٹھے۔ باقی عثمانی فوج کئی اطراف سے شہر میں داخل ہوگئی۔ دفاع کرنے والے بھی اپنے قائد کے ختم ہو جانے کے بعد فرار ہوگئے اور مسلمان شہر فتح کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ اس وقت سلطان محمد فاتح اپنے گھوڑے پر سوار، اپنی فوج کے ساتھ دشمن پر غلبہ پانے اور فتح یاب ہونے کی خوشی میں شریک تھا۔ اس کے اردگرد اس کے کمانڈر جمع تھے جو اسے فتح کی مبارک باد دے رہے تھے۔ اور وہ

[1] تاريخ الدولة العلية: 164، و تاريخ الدولة العثمانية: 139، و محمد الفاتح: 137، و فتح القسطنطينية: 115.

کہہ رہا تھا: ''الحمدللہ۔ اللہ تعالیٰ شہداء پر رحمت فرمائے، مجاہدین کو شرف وعزت سے نوازے اور میری قوم کو فخر کے ساتھ شکر کی توفیق دے۔''[1]

شہر کے اندر بعض دفاعی مراکز موجود تھے۔ وہ بہت سے مجاہدین کی شہادت کا باعث ہوئے۔ شہر کے بہت سے لوگوں نے گرجا گھروں میں پناہ لے لی۔

منگل بیس جمادی الاولیٰ 857ھ مطابق 29 مئی 1453ء کی دوپہر نہیں ہوئی تھی کہ سلطان فاتح شہر کے وسط میں پہنچ گیا۔ اس کی فوج اور اس کے کمانڈر اس کے گرد جمع تھے اور ماشاء اللہ! ماشاء اللہ! کہہ رہے تھے۔ سلطان نے ان کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا: ''آج تم قسطنطنیہ کے فاتح بن گئے ہو جن کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے خبر دی تھی۔'' سلطان نے انھیں فتح کی مبارک باد دی اور کسی کو قتل کرنے سے منع کر دیا۔ اس نے حکم دیا کہ عوام کے ساتھ نرمی سے پیش آئیں اور ان سے حسن سلوک کریں۔ وہ اپنے گھوڑے سے اتر آیا اور اللہ کا شکر اور اس کی حمد کرتے ہوئے تواضع کے ساتھ زمین پر سجدہ ریز ہو گیا، پھر اٹھ کر ایا صوفیا کے گرجے کی طرف گیا۔ وہاں بے شمار لوگ جمع ہو چکے تھے۔ ان میں پادری اور راہب بھی شامل تھے جو عیسائیوں کے لیے دعائیں کیا کرتے تھے۔ جب وہ اس کے دروازوں کے قریب پہنچا تو گرجے میں موجود عیسائی ڈر گئے اور سخت خوف زدہ ہوئے۔ ایک راہب نے اٹھ کر اس کے لیے دروازہ کھولا۔ سلطان نے اس سے کہا کہ لوگوں کو تسلی دے اور ان سے کہے کہ وہ امن و امان کے ساتھ اپنے گھروں کو چلے جائیں۔ عوام مطمئن ہو گئے۔ بعض راہب کلیسا کے تہہ خانوں میں چھپے ہوئے تھے۔ انھوں نے فاتح کی فراخ دلی اور درگزر دیکھا تو باہر نکل کر مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد فاتح نے گرجے کو مسجد میں تبدیل کرنے کا حکم دے دیا۔[2]

سلطان نے ایا صوفیا میں اگلا جمعہ ادا کرنے کی تیاری کا حکم دیا۔ کاریگر اس کے لیے تیاری کرنے لگے۔ انھوں نے صلیبیں اور مجسمے نکال دیے اور تصویروں پر چونا پھیر کر انھیں مٹا دیا۔ خطیب کے لیے منبر تیار کر دیا گیا۔ گرجے کو مسجد میں تبدیل کرنا قابلِ اعتراض نہیں کیونکہ شہر جنگ کے ذریعے سے حاصل کیا گیا تھا

---

[1] محمد الفاتح: 139. [2] سلاطین آل عثمان: 28، و تاریخ الدولة العثمانیة: 141، و فتح القسطنطینیة: 117، و محمد الفاتح: 143، مصطفیٰ کمال اتاترک کے دور میں اس مسجد کو میوزیم بنا دیا گیا اور مسلمانوں کو اس میں نماز پڑھنے سے روک دیا گیا۔

اور شریعتِ اسلامی میں جنگ سے حاصل ہونے والے شہر کے خاص احکام ہیں۔ علاوہ ازیں اس دور میں عیسائیوں نے جب مسجدوں پر قبضہ کیا تو ایسے ہی بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر کیا تھا بلکہ آج بھی ان کی یہی روش ہے۔

سلطان نے انھیں اپنے مذہبی اعمال ادا کرنے کی آزادی دی۔ انھیں اپنے مذہبی پیشوا منتخب کرنے کا حق بھی دیا جنھیں ان کے آپس کے مقدمات میں فیصلے کرنے کا اختیار تھا۔ اسی طرح دوسرے صوبوں میں پادریوں کو یہ حقوق دیے گئے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان سب پر جزیہ بھی عائد کیا گیا۔ [1]

فتح ہونے سے پہلے قسطنطنیہ کا شہر یورپ میں اسلام کے پھیلاؤ میں ایک بہت بڑی رکاوٹ تھا، اس لیے اس کا فتح ہونا یورپ میں اسلام کے پوری قوت کے ساتھ داخلے کا دروازہ کھولنے کے مترادف تھا۔ قسطنطنیہ کی فتح عالمی تاریخ کے اہم واقعات میں شمار ہوتی ہے۔ یورپی مؤرخین نے اسے قرونِ وسطی کا اختتام اور نئے دور کی ابتدا شمار کیا ہے۔ [2]

سلطان محمد فاتح نے شہر کے حفاظتی انتظامات دوبارہ قائم کیے اور اسے عثمانی سلطنت کا دارالحکومت بنا لیا۔ سلطان نے اس کا نام اسلام بول، یعنی اسلام کا شہر رکھ دیا۔ [3]

② مشرقی یورپ کی فتوحات

عثمانی سلطنت اپنے ابتدائی دور ہی سے اناطولیہ کے علاقے میں بازنطینی سلطنت سے برسرِ پیکار تھی۔ عثمانیوں نے 726ھ تا 755ھ (1326ء تا 1354ء) کے دوران میں بحیرۂ مرمرہ اور بحیرۂ اسود کے قریب یورپ کے مقابل ایشیائی ساحلوں پر اپنا تسلط قائم کر لیا تھا۔ سلطان غازی ''اورخان اول'' کے دورِ حکومت میں 754ھ (مطابق 1353ء) میں بازنطینی بادشاہ ''جان پیلیولوگس'' نے عثمانی سلطنت سے سربوں کے خلاف مدد مانگی جو اس کے لیے خطرے کا باعث بن گئے تھے۔ سلطان نے اپنے بیٹے سلیمان پاشا کو حکم دیا کہ سمندر پار کر کے یورپ پہنچے اور ان علاقوں میں جہاد کے لیے اس موقع سے فائدہ اٹھائے۔ عثمانیوں نے بازنطینیوں سے اتفاق کر کے ان کے تعاون سے سربوں کی سرکوبی کے لیے سمندر پار کیا۔ اس طرح عثمانیوں کو ان علاقوں کے حالات سے متعارف ہونے کا موقع مل گیا۔ عثمانیوں نے کئی لڑائیوں میں سربوں کے

---

[1] تاریخ الدولة العلية: 165، و الدولة العثمانية: 63/1، و محمد الفاتح: 142. [2] تاريخ الدولة العثمانية: 143، و استنبول: 49. [3] تاريخ الدولة العثمانية: 140، و استنبول: 48.

خلاف بازنطینیوں کی مدد کی۔ ان کا احسان مانتے ہوئے بازنطینی بادشاہ نے عثمانیوں کو یورپی کناروں پر قلعہ تزنپ (Tzynpe) دے دیا۔ یورپ میں عثمانیوں کا یہ پہلا قلعہ تھا۔ [1]

762ھ مطابق 1361ء میں عثمانی سلطان مراد اول نے ''ادرنہ'' (Adrianople) شہر فتح کر لیا جو یورپ میں رومیوں کا ایک اہم شہر تھا، اور عثمانی سلطنت کا دارالحکومت ''بورصہ'' سے وہاں منتقل کر دیا، چنانچہ وہ یورپ میں عثمانیوں کا مرکزی شہر بن گیا اور وہاں جہادی تحریک نے زور پکڑا۔ سلطان مراد نے اپنے والد کی زندگی ہی میں یورپی قیدیوں کے بیٹوں پر مشتمل ایک نئی فوج بنا کر اسے مضبوط کیا۔ علماء نے انھیں تعلیم دی اور کمانڈروں نے ان کی تربیت کی۔ عثمانی سلطنت میں یہ فوج ینی چری (انکشاریہ) کے نام سے مشہور ہوئی۔ بعد میں یورپ وغیرہ کی فتوحات میں اس فوج نے اہم کردار ادا کیا۔ علاوہ ازیں سلطان مراد نے اپنی سلطنت کی یورپ میں توسیع کے لیے عیسائیوں سے کئی جنگیں لڑیں جن میں بازنطینی اور سرب دونوں شامل تھے، اس طرح عثمانی سلطنت کی سرحد سربیا، بلغاریہ اور البانیہ سے جا ملی۔

اس سے یورپ کی عیسائی دنیا کو بہت پریشانی ہوئی، چنانچہ پوپ اربن پنجم (Urban V) نے یورپ کے عیسائی بادشاہوں کو عثمانیوں سے ایک مذہبی جنگ لڑنے کی دعوت دی اور انھیں عیسائیوں پر عثمانی فتوحات کے خطرے سے خبردار کیا اور انھیں یہ احساس دلایا کہ اس سے یورپ میں اسلام کو فروغ حاصل ہوگا جس کا نقصان عیسائیت کو ہوگا۔ پوپ کی اس دعوت پر سربوں کے بادشاہ ''اورک پنجم'' نے لبیک کہا۔ اس نے سلطان مراد کی غیر حاضری میں ہنگری، سربیا اور بوسنیا کے سواروں کی بڑی فوجیں لے کر حملہ کرتے ہوئے ''ادرنہ'' کا رُخ کیا۔ یہ واقعہ 766ھ مطابق 1363ء میں پیش آیا۔ سلطان کے نائبوں اور کمانڈروں نے سربیا کے بادشاہ اور اس کے ساتھیوں کو ایک بڑی جنگ میں سخت ہزیمت سے دوچار کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ''وہ مٹی کو اپنے خون سے رنگین کر کے پیٹھ پھیر کر بھاگ گئے۔'' [2]

عثمانی فتوحات کے نتیجے میں متعدد یورپی ممالک انھیں جزیہ دینے پر مجبور ہوگئے۔ بعض دوسرے ممالک نے عثمانیوں کی قوت سے خوف زدہ ہو کر ان کے غیظ وغضب سے بچنے کے لیے ان سے دوستی کا اعلان کر دیا، چنانچہ عثمانیوں کا اقتدار ہنگری اور رومانیہ کے علاوہ بحیرۂ اڈریاٹک کے قریبی علاقوں اور البانیہ تک پہنچ گیا۔

---

[1] تاریخ الدولة العثمانية:96. [2] تاریخ سلاطین آل عثمان:16، و تاریخ الدولة العلية:131.

جنگ کوسووا

سلطان مراد نے خود بھی اور اس کے کمانڈروں نے بھی بلقان کے علاقے میں دور تک قبضہ کر لیا تھا۔ اس وجہ سے سرب اُٹھ کھڑے ہوئے۔ انھوں نے ایک سے زیادہ دفعہ کوشش کی کہ سلطان کی یورپ سے غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر بلقان اور اس کے قرب و جوار میں عثمانی لشکر پر حملہ کر دیں۔ بار بار اور کئی مقامات پر لڑائیوں کے باوجود وہ عثمانیوں کو ان کے مقامات سے پیچھے نہ ہٹا سکے، چنانچہ بوسنیا، سربیا اور بلغاریہ والوں نے سلطان سے جنگ کرنے کے لیے بہت بڑا یورپی صلیبی لشکر تیار کیا۔ سلطان نے اچھی طرح تیاری کی تھی اور اب اپنی فوج کے ساتھ بلقان میں کوسووا کے علاقے میں پہنچ چکا تھا۔ سلطان کے ہمراہ اس کے دو بیٹوں بایزید اور یعقوب کے علاوہ سرداروں اور کمانڈروں کی ایک بہت بڑی تعداد تھی۔ [1]

---

[1] تاریخ الدولة العثمانية: 100، و تاریخ سلاطین آل عثمان: 16.

جنگِ کوسووا کا ایک منظر

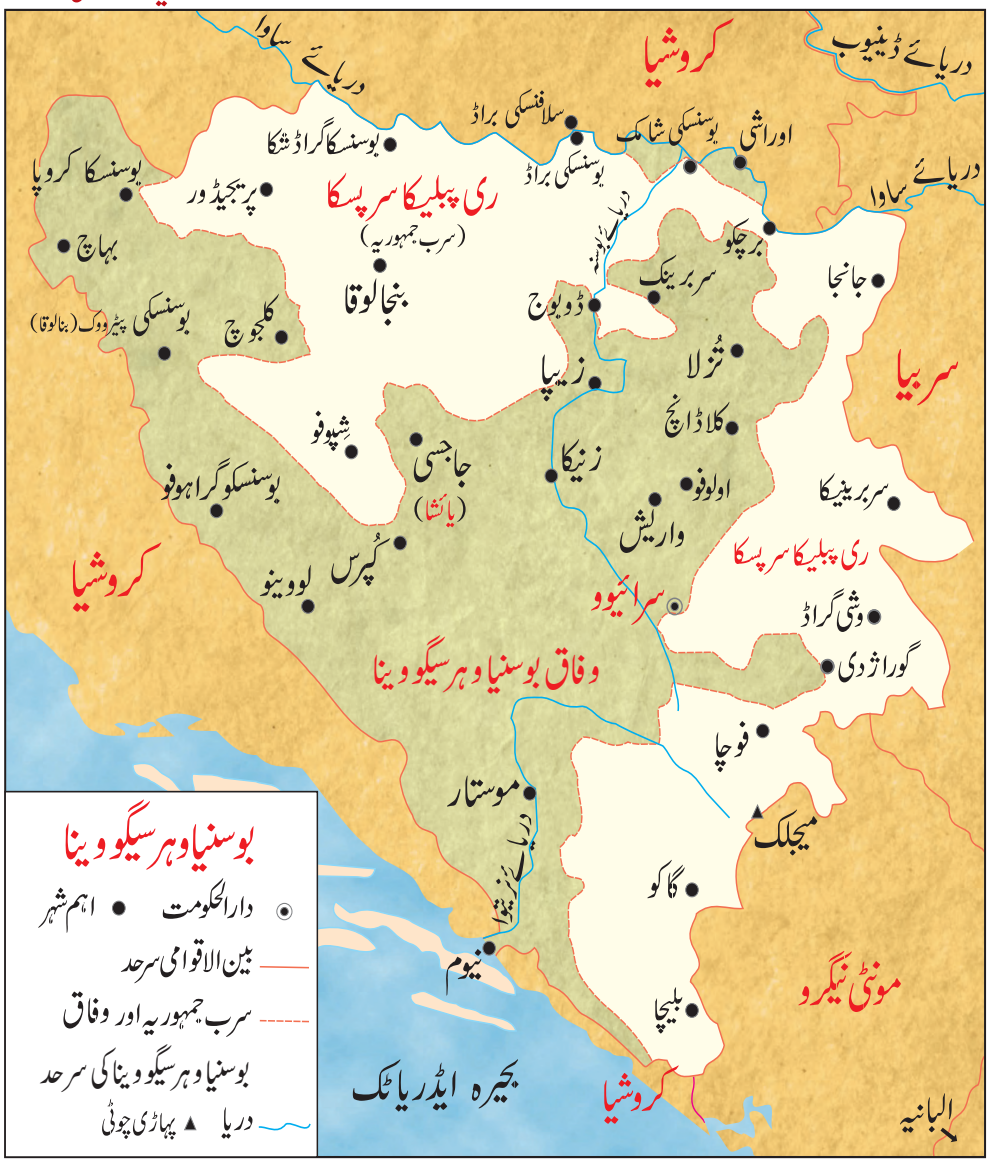

جنگ سے پہلی رات شدید اندھیرا تھا اور سخت آندھی آئی تھی جس سے ہر جگہ بے ترتیبی پیدا ہوگئی۔ اس رات سلطان مراد کو ہاتھ اٹھائے اس طرح دعا کرتے سنا گیا: ''یااللہ! یا رحیم! اے آسمانوں کے مالک! اے دعائیں قبول کرنے والے! مجھے رسوا نہ کرنا۔ یا رحمان! یا رحیم! اپنے فقیر بندے کی دعا اس بار ضرور قبول کر لے۔ ہم پر آسمان سے بارش برسا دے اور تاریکی کے بادل منتشر کر دے تاکہ ہم اپنے دشمنوں کو دیکھ سکیں۔ اے ہر وجود میں موجود! تو یکتا ہے اور ہر وجود کا حقیقی مالک ہے۔ ہم تیرے گنہگار بندے ہیں۔ تو

دریائے بِستریکا پر کوسوو شہر میں واقع قدیم عثمانی سنان پاشا مسجد اور پتھر کے پُل کا رات کا منظر

ہی عطا کرنے والا ہے اور ہم تیرے فقیر ہیں۔ میں تو محض تیرا ایک فقیر اور گڑگڑانے والا بندہ ہوں۔ تو سب کچھ جاننے والا ہے۔ اے غیبوں اور رازوں کو جاننے والے! اے سینوں میں چھپی ہوئی باتیں جاننے والے! میری اپنی کوئی غرض اور مصلحت نہیں! میں غنیمت حاصل کرنے نہیں آیا۔ مجھے صرف اخلاص کے ساتھ تیری خوشنودی مطلوب ہے۔ یااللہ! یا علیم! اے ہر وجود میں موجود! اپنی جان تجھ پر قربان کرتا ہوں۔ میری عرض قبول کر لے۔ مسلمانوں کو دشمنوں کے مقابل ناکام نہ کرنا۔ یااللہ! یا ارحم الراحمین! مجھے ان کی موت کا سبب نہ بنانا۔ انھیں فتح یاب کردے۔ میں اپنی جان تجھ پر فدا کرتا ہوں، یارب! میری ہمیشہ سے یہ خواہش رہی ہے اور اب بھی یہی خواہش ہے کہ میں لشکر اسلام کے لیے شہید ہو جاؤں۔ یااللہ! مجھے ان کی مصیبت نہ دکھانا۔ یااللہ! اس دفعہ مجھے اجازت دے کہ تیری راہ میں اور تیری خوشنودی کے لیے شہید ہو جاؤں۔'' [1]

بیس جون 1389ء کی صبح دشمنوں سے مسلمانوں کی انتہائی شدید جنگ ہوئی جو آٹھ گھنٹے جاری رہی۔ اس

---

[1] العثمانیون والبلقان: 52.

میں سلطان خود شریک ہوا۔ فریقین میں گھمسان کی جنگ ہوئی۔ سربوں نے بہادری سے مقابلہ کیا۔ بہت دیر تک جنگ کا پانسا بار بار پلٹتا رہا۔ دونوں طرف سے بہت سے لوگ جاں بحق ہوئے۔ معرکے کے دوران میں ایک سرب کمانڈر تقریباً دس ہزار سپاہیوں سمیت آ کر عثمانیوں کی صف میں شامل ہوگیا۔ [1]

اس کا شدید اثر ہوا کہ سرب کمزور ہوگئے اور انھیں شکست ہوگئی۔ مسلمان فتح یاب ہوئے اور سرب لشکر کا اکثر حصہ قتل ہوگیا۔ ان کا بادشاہ مسلمان سپاہیوں کے ہاتھوں گرفتار ہو کر قتل ہوگیا۔ جنگ کے آخر میں سلطان مسلمان شہداء کی صفوں میں پھر رہا تھا اور ان کے حق میں دعائیں کر رہا تھا اور زخمیوں کے حالات معلوم کر رہا تھا۔ اسی دوران میں ایک سرب فوجی جو مردہ بن کر پڑا ہوا تھا، اٹھ کر تیزی سے سلطان کی طرف بڑھا۔ محافظوں نے اسے گرفتار کر لیا۔ اس نے یہ ظاہر کیا کہ وہ سلطان سے گفتگو کرنا اور اس کے ہاتھ پر اسلام قبول کرنا چاہتا ہے۔ سلطان نے محافظوں کو اشارہ کیا کہ اسے چھوڑ دیں۔ اس نے ظاہر کیا کہ وہ سلطان کا ہاتھ چومنا چاہتا ہے۔ تب اس نے تیزی سے حرکت کر کے ایک زہر آلود خنجر نکالا اور سلطان پر وار کر دیا۔ اور 15 شعبان 791ھ کو سلطان شہید ہوگیا۔ [2]

سلطان مراد کے آخری الفاظ یہ تھے: ''میں (دنیا سے) کوچ کرتے وقت اللہ کا شکر ادا کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ غیبوں کو جاننے والا اور فقیر کی دعا قبول کرنے والا ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ شکر اور ثنا کا حق دار صرف وہی ہے۔ اب جبکہ میری زندگی کا اختتام ہونے والا ہے، میں نے اسلامی لشکر کو فتح یاب ہوتے دیکھ لیا ہے۔ میرے بیٹے بایزید کے فرماں بردار رہنا۔ قیدیوں کو تعذیب کا نشانہ نہ بنانا۔ انھیں کوئی تکلیف نہ دینا۔ ان سے کوئی چیز نہ چھیننا۔ اس لمحے میں تمھیں الوداع کہتا ہوں اور اپنے عظیم فاتح لشکر کو اللہ کی رحمت کے سپرد کرتا ہوں۔ وہی ہر مصیبت اور آفت سے ہماری سلطنت کی حفاظت فرمائے گا۔'' [3]

محافظوں کو اس حادثے کا یقین نہ آیا اور وہ کچھ نہ کر سکے کیونکہ غدار نے بہت تیزی سے یہ حرکت کی تھی۔ سلطان کے شہید ہو جانے کے باوجود اس معرکے میں مسلمانوں کی فتح کی وجہ سے آیندہ کئی صدیوں کے لیے بلقان پر عثمانیوں کی حکومت قائم ہوگئی۔ [4]

---

[1] تاريخ الدولة العلية: 135. [2] تاريخ سلاطين آل عثمان للقرماني: 16، و تاريخ الدولة العلية: 136، و تاريخ الدولة العثمانية: 100، و تاريخ سلاطين آل عثمان ليوسف آصاف: 38. [3] العثمانيون والبلقان: 53. [4] تاريخ الدولة العثمانية: 101.

معرکہ نیکوپولس

سلطان مراد کی وفات کے بعد اس کے بیٹے بایزید نے حکومت سنبھالی۔ اس نے بلقان کے علاقے میں مزید فتوحات حاصل کیں۔ بلغاریہ، رومانیہ، سالونیکا[1] اور البانیہ کو عثمانی سلطنت میں شامل کر لیا۔ قسطنطنیہ پر بہت دباؤ ڈالا۔ اس نے اس شہر کو فتح کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوا۔ اس کوشش کے نتیجے میں پوپ اور یورپی اقوام اٹھ کھڑی ہوئیں اور عثمانی سلطنت کے خلاف ایک دوسرے سے مدد طلب کی۔ مزید برآں ہنگری کے بادشاہ نے ان سے مدد مانگ لی اور عثمانی سلطنت کے خلاف مذہبی صلیبی جنگ شروع کر دی۔ مغربی یورپ نے اس دعوت پر لبیک کہا جن میں فرانس اور اس کی متحدہ ریاستیں پیش پیش تھیں۔ ان میں جرمنی کے بعض علاقے، سوئٹزرلینڈ اور رودس بھی شامل تھے، حالانکہ ان میں شدید مذہبی اختلافات پائے جاتے تھے کیونکہ ان میں سے کچھ آرتھوڈکس مذہب سے تعلق رکھتے تھے اور کچھ کیتھولک مذہب سے۔ اس کے باوجود ایک متحدہ یورپی لشکر تیار ہوگیا جن میں ساٹھ ہزار فوجی ہنگری کے تھے، دس ہزار فرانس کے اور باقی مذکورہ بالا ریاستوں کے۔ ان کے ساتھ سرب بھی شامل تھے۔ ان سب کا ہدف عثمانیوں کو بلقان اور یورپ سے نکال کر ایشیا میں دھکیلنا تھا۔[2]

---

[1] سالونیکا 1387ء میں سلطان مراد اول کے عہد میں فتح ہو چکا تھا۔ [2] ''تہذیب کی کہانی''، ول ڈیوراں، ص: 180۔

عثمانی فوج نیکوپولس (بلغاریہ) میں داخل ہوتے وقت

جنگِ نیکوپولس (بلغاریہ) کا ایک منظر

یہ لشکر نیکوپولس شہر کی طرف روانہ ہوا جو اس دور میں یورپ میں عثمانی سلطنت کا ایک بڑا شہر تھا اور وہاں عثمانیوں کی ایک مضبوط چھاؤنی موجود تھی (ان دنوں یہ شمالی بلغاریہ میں ہے)۔ یورپ کی افواج نے دریائے ڈینیوب پار کر کے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ وہاں موجود مسلمان افواج نے ثابت قدمی اور بہادری سے دفاع کیا۔ سلطان بایزید اناطولیہ میں مشغول تھا۔ اسے جونہی یورپی لشکر کی نقل و حرکت کا علم ہوا، اس نے ایک بہت بڑا لشکر تیار کیا جس میں عثمانیوں کے ساتھ ساتھ ان کی دوست یورپی اقوام بلغاریہ اور بلقان وغیرہ کے فوجی بھی شامل تھے جن کی تعداد تقریباً دو لاکھ تھی۔ سلطان انھیں لے کر محصور شہر نیکوپولس کی طرف روانہ ہو گیا۔ عثمانی لشکر محصور شہر تک پہنچا اور وہاں کے مسلمانوں کو رات ہی میں اپنی آمد کی اطلاع کر دی۔ اگلے دن صبح کے وقت عثمانی لشکر اور یورپی لشکر کے درمیان گھمسان کی جنگ ہوئی۔ یہ جنگ 23 ذوالقعدہ 798ھ مطابق 27 ستمبر 1396ء کو ہوئی۔ [1]

جنگ کا نتیجہ یہ ہوا کہ عثمانی فوج نے یورپ کی متحدہ فوج پر فتح پائی۔ ان کے کئی بڑے بڑے لیڈر گرفتار ہوئے، بالخصوص فرانسیسی کمانڈر اور سردار جو گرفتار ہوئے، ان کی تعداد ستائیس تک پہنچ گئی۔ علاوہ ازیں فرانسیسی فوج کا مرکزی علم عثمانیوں کے مالِ غنیمت میں شامل تھا۔ ان کی فوج کی زیادہ تعداد قتل ہو گئی۔ [2]

یورپ کی ایک لاکھ تیس ہزار فوجیوں پر مشتمل متحدہ فوج میں سے صرف تقریباً بیس ہزار بچ سکے۔ باقی سب گرفتار ہوئے یا میدانِ جنگ میں قتل ہو گئے۔ فرانس کا کاؤنٹ (نواب) ڈی نیورس بھی گرفتار ہوا لیکن اس نے سلطان سے قسم کھا کر وعدہ کر لیا کہ وہ اور اس کا ملک دوبارہ مسلمانوں سے جنگ نہیں کرے گا۔ تب سلطان نے اسے آزاد کر دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ سلطان نے اسے خبردار بھی کر دیا کہ اگر یورپی اقوام جنگ کرنا چاہتی ہیں تو وہ یورپ کی تمام اقوام سے جنگ کرنے کو تیار ہے۔ [3]

---

[1] الدولة العلية: 144، و تاريخ الدولة العثمانية: 108. [2] محمد الفاتح: 33، یوسف آصاف کی تاریخ سلاطین آل عثمان: 44، قرمانی کی تاریخ سلاطین آل عثمان: 18. [3] تاريخ الدولة العلية: 144.

③ عثمانی سلطنت اور عالم اسلام کا دفاع

آخری اسلامی مرکز غرناطہ پر 897ھ مطابق 1492ء میں ہسپانوی عیسائیوں کا قبضہ ہوگیا تھا، چنانچہ دس سال سے بھی کم عرصے کے بعد اندلس میں مسلمانوں کا خاتمہ شروع ہوگیا۔ تب شاہی فرمان جاری ہوگیا کہ مسلمانوں کو تین چیزوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہوگا: وہ عیسائی مذہب اختیار کر لیں یا جلاوطن ہو جائیں یا انھیں قتل کر دیا جائے گا۔ [1]

ان بے کس مسلمانوں کا اس خوفناک طریقے سے قتل عام کیا گیا کہ اس کا ذکر کرتے ہوئے تاریخ کی پیشانی پر ندامت سے پسینہ آجاتا ہے۔ عثمانی بادشاہ سلیم اول نے چاہا کہ عثمانی سلطنت میں عیسائیوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا جائے لیکن مسلمانوں نے اس رائے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور سختی سے اس کی مخالفت کی۔ [2] اس سے دس سال سے بھی کم مدت کے بعد پرتگالیوں نے مسلمانوں کے مشرقی علاقوں پر حملے شروع کر دیے۔ وہ بہت سنگ دل تھے۔ جو بھی ان کے سامنے آتا، وہ اس پر رحم نہیں کرتے تھے، خواہ وہ دشمن ہو یا دوست۔ ان کا طرزِ عمل یہ تھا کہ جو گاڑی سامنے آئے، اسے توڑ پھوڑ دیا جائے اور اس میں سفر کرنے والوں کو قتل کر دیا جائے۔ وہ جن شہروں اور بستیوں سے گزرتے، انھیں نذرِ آتش کر دیتے تھے۔ مزید برآں وہ بعض گروہوں کو امان دیتے، پھر جب وہ ان پر قابو پا لیتے تو انھیں بڑی بے دردی سے قتل کر دیتے تھے اور عہد شکنی کی پروا نہ کرتے۔ [3]

سب سے پہلے پرتگالیوں کا سامنا خاندانِ غلاماں (ممالیک) کی سلطنت سے ہوا۔ مصر، شام اور حجاز ان کے زیر انتظام تھے، لہٰذا یورپ کے ان عیسائی حملوں کا مقابلہ کرنا ان کی ذمہ داری تھی۔ ممالیک نے شروع

سلطنت عثمانیہ سلطان سلیم اول کی تخت نشینی (24 اپریل 1512ء) کے وقت

[1] موقف الدولة العثمانية: 40. [2] الدولة العثمانية، دولة الإسلامية مفترى عليها: 414/1. [3] پرتگالی مصنّفین کی کتابوں میں بھی اس قسم کے واقعات کا ذکر ہے۔ ملاحظہ کیجیے: لوریمر کی في دليل الخليج: القسم التاريخي: 12/1، 16، 28.

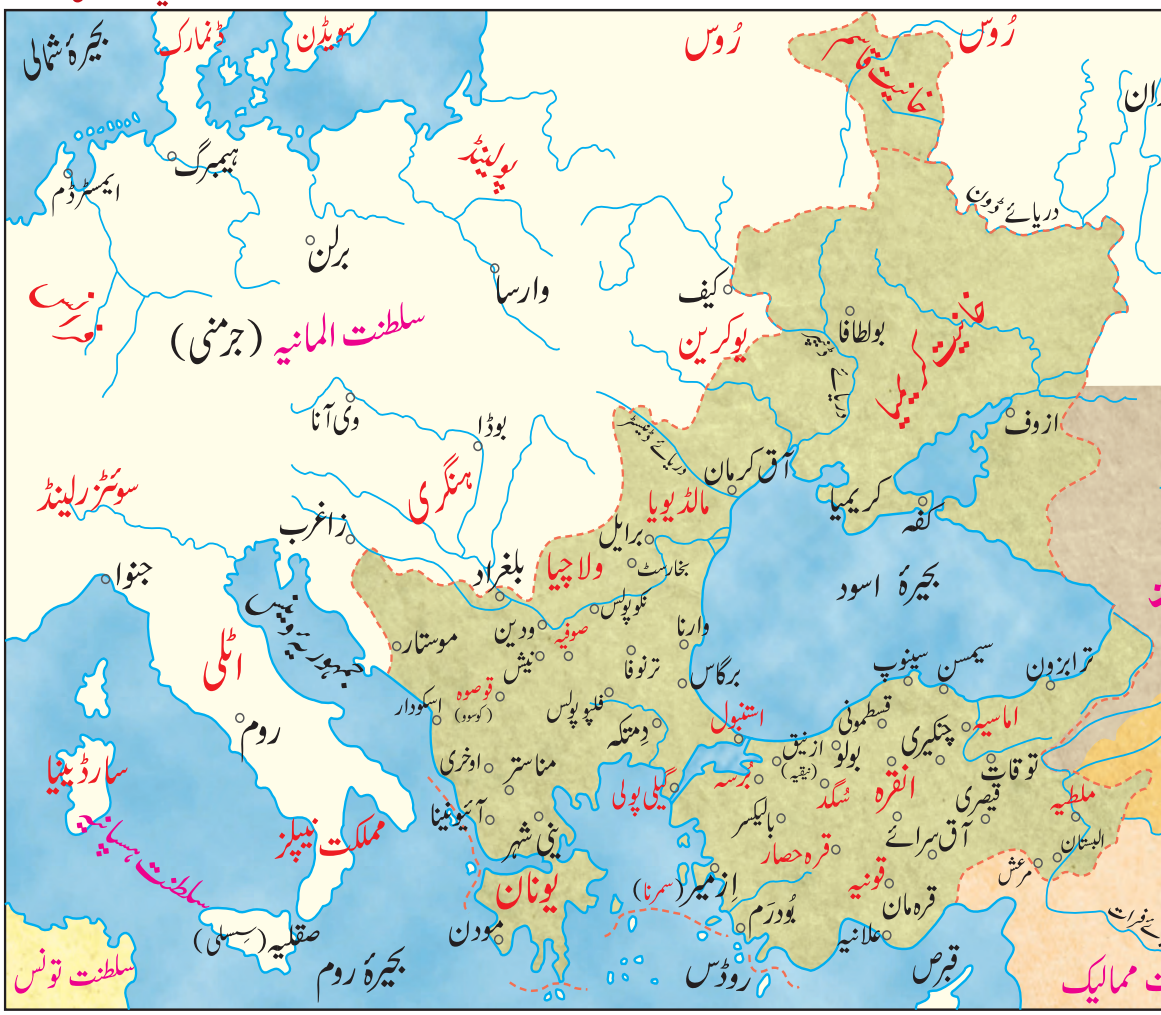

میں یہ فریضہ انجام دینے کی کوشش کی اور مختلف مشکلات کے باوجود انھیں کسی حد تک کامیابی بھی حاصل ہوئی۔ علاوہ ازیں اس پہلو سے وہ اور عثمانی ایک دوسرے سے تعاون کرتے تھے، چنانچہ سلطان بایزید کے دور میں انھوں نے پرتگالیوں کے خلاف مل کر کام کیا۔ 906ھ (مطابق 1500ء) میں الواریز کیبرال کے حملے کا مقابلہ کرنے کے لیے انھوں نے متحدہ اقدامات کیے۔ [1]

البتہ بعد میں ان تعلقات کی نوعیت تبدیل ہوگئی جب اسلامی دنیا میں اپنے اپنے زیرِ اثر علاقوں کے بارے میں عثمانیوں کی ممالیک سے کشمکش شروع ہوگئی۔ [2]

---

[1] تاريخ الدولة العثمانية: 231، غسال على الرمال کی صراع المسلمين مع البرتغاليين في البحر الأحمر: 204.

[2] تاريخ الدولة العثمانية: 231، و الفتح العثماني للشام و مصر: 110.

عثمانی دور کی سلطان سلیم مسجد (قونیہ)

پرتگالیوں کا مقابلہ کرنے میں ممالیک نے عمدہ کردار ادا کیا۔ ان کے بحری بیڑے حسین کردی کی قیادت میں مصر سے چل کر بحر ہند میں پہنچ گئے لیکن انھوں نے 915ھ (مطابق 1509ء) میں ''دیو'' کے مقام پر مشہور جنگ میں پرتگالیوں سے شکست کھائی۔[1] اس سے مستقبل کے واقعات پر گہرا اثر پڑا کیونکہ اس کے بعد پرتگالی خود کو برتر محسوس کرنے لگے اور اس علاقے میں ان کی بحریہ کا اثر و رسوخ زیادہ ہوگیا۔[2]

جب 1517ء میں مصر اور شام پر عثمانیوں کا قبضہ ہوگیا اور ممالیک کی سلطنت ختم ہوگئی تو عثمانیوں کو اسلامی دنیا میں سرداری کا مقام حاصل ہوگیا۔ اس کے نتیجے میں وہ ایک بار پھر مشرقی افریقہ میں یورپی طاقتوں کے مقابل آ گئے جو اس زمانے میں عالم اسلام کے زیادہ سے زیادہ علاقوں پر قبضہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے، بالخصوص پرتگالی جنھوں نے سب سے پہلے یہ کام کیا، چنانچہ عثمانیوں اور پرتگالیوں میں کئی محاذ گرم ہوگئے جن میں بحیرۂ احمر (قلزم)، مشرقی افریقہ اور خلیج عربی (خلیج فارس) زیادہ اہم تھے۔ ان میں کشمکش کی تفصیل درج ذیل ہے:

---

[1] چند پروفیسروں کی مشترکہ تصنیف تاريخ البحرية: 570. [2] عثمان الرمال کی: صراع المسلمين مع البرتغاليين في البحر الأحمر: 89.

بحیرۂ احمر (قلزم) کا دفاع

عالم اسلام میں بحیرۂ احمر کو ہر دور میں خاص اہمیت حاصل رہی ہے کیونکہ یہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے مقدس مقامات کے قریب ہے۔ صلیبیوں نے اس سے پہلے بھی سلطان صلاح الدین کے ایام میں بحیرۂ احمر میں پاؤں جمانے کی کوشش کی تھی لیکن صلاح الدین نے بڑی حکمت اور قوت سے انھیں ناکام کر دیا تھا۔ دسویں صدی ہجری کے شروع میں اہل یورپ نے، جن میں پرتگالی سرفہرست تھے، اسلام اور مسلمانوں سے دشمنی کی بنیاد پر بحیرۂ قلزم تک پہنچنے کی کوشش کی اور مسلمانوں کے خلاف حبشہ کی سلطنت سے تعاون کیا کیونکہ انھیں یقین تھا کہ حبشہ اور پرتگال کے باہمی تعاون سے مکہ مکرمہ کو صفحۂ ہستی سے مٹایا جاسکتا ہے اور یہ ان کا سب سے اہم ہدف ہے۔ [1]

مسلمانوں کے خلاف باہمی تعاون اور اس مقصد کے لیے عملی اقدامات کے پروگرام ترتیب دینے کے لیے حبشیوں اور پرتگالیوں میں متعدد رابطے ہوئے۔ ممالیک اور ان کے بعد اس مرحلے میں ذمہ داری سنبھالنے والے عثمانی ان رابطوں کی معلومات حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے رہتے تھے کیونکہ انھیں اس امر کا پورا احساس تھا کہ حبشہ اور پرتگال کے عیسائیوں کا باہمی تعاون کس قدر خطرناک ثابت ہوسکتا ہے، چنانچہ عثمانی ہمیشہ مشرقی افریقہ کے ان مسلمان ممالک کی مدد کرتے رہتے تھے جن کا حبشیوں سے ٹکراؤ رہتا تھا، اس لیے حبشی بھی عثمانیوں سے خطرہ محسوس کرتے تھے۔ [2]

عثمانیوں نے اپنے مصری بحری بیڑے کے ذریعے سے اس علاقے میں بحریہ کی نقل وحرکت میں اضافہ کر دیا۔ بحیرۂ قلزم پر پرتگالیوں کا پہلا حملہ ''بوقرق'' کی قیادت میں ہوا۔ اس نے عدن پر 919ھ مطابق 1513ء میں حملہ کیا۔ اس وقت تک اس علاقے میں عثمانی نہیں آئے تھے۔ اس نے عدن پر حملے کے فوراً بعد بحیرۂ قلزم پر حملے کا منصوبہ بنایا۔ اس مقصد کے لیے اس کی مدد کے لیے یورپ سے بھی افواج پہنچ گئیں، اس لیے اہل حجاز بہت خوف زدہ ہوئے۔ انھیں خطرہ محسوس ہوا کہ بوقرق کسی بھی وقت جدہ کے قریب پہنچ سکتا ہے، چنانچہ شریف مکہ ''برکات دوم'' (903-931ھ) کو پرتگالیوں کے متوقع حملے کا مقابلہ کرنے کے لیے جدہ میں کچھ فوج رکھنی پڑی لیکن وہ لوگ اپنے مقررہ وقت پر (931ھ) علاقے میں نہ پہنچ سکے۔ ممکن ہے ہواؤں

---

[1] الدولة العثمانية دولة الإسلامية مفترى عليها: 2/698، 862، و صراع البرتغاليين مع المسلمين في البحر الأحمر: 89، 91. [2] تاريخ الدولة العثمانية: 331.

سلطنت عثمانیہ: سلیم اول کی وفات (22 ستمبر 1520ء) کے وقت

کا ناموافق ہونا اس کا سبب بنا ہو اور ممکن ہے کہ بوقرق اس وقت خلیج کے علاقے میں مشغول ہو۔ [1]

پرتگالیوں نے 923ھ (مطابق 1571ء) میں ''لوبرسواریز'' کی قیادت میں بحیرۂ قلزم پر ایک نیا حملہ کیا۔ یہ لوگ عدن سے گزر کر حدیدہ پہنچے، پھر جدہ کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں عثمانی بحریہ کے قائد ''سلیمان رئیس'' کی قیادت میں محافظ فوج نے مقابلہ کیا اور ان کے جہاز توڑ پھوڑ دیے۔ اس نے کچھ پرتگالی گرفتار کر لیے اور انھیں عثمانی سلطان کے پاس استنبول بھیج دیا۔ اس واقعے کے بعد عثمانی سلطنت کو پرتگالیوں کی طرف سے مزید حملوں کا خطرہ محسوس کرتے ہوئے اپنی فوجی قوت میں اضافہ کرنا پڑا۔ اور واقعی 927ھ (1520ء) میں ''لوبرڈی سکویرا'' کی قیادت میں پرتگالیوں کا نیا لشکر آ گیا۔ یہ لشکر جدہ کے قریب پہنچ گیا تھا لیکن مخالف ہواؤں کی وجہ سے جدہ نہ پہنچ سکا۔ اس کے علاوہ اس کے کمانڈر نے محسوس کیا کہ عثمانی اس کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہیں، لہٰذا اس نے اپنے بحری بیڑے کا رخ بحیرۂ احمر کے مغربی کنارے پر ''مصوع'' (اریٹیریا) کی طرف پھیر دیا۔ اس طرح یہ فوج اپنا وہ بڑا مقصد حاصل کرنے میں ناکام رہی جس کے لیے وہ آئی تھی۔ اس کے نتیجے میں اس خطے میں مستقبل میں پرتگالیوں کی نقل وحرکت متاثر ہوئی۔ [2]

اس کے بعد عثمانی سلطنت نے اپنی توجہ بحیرۂ قلزم کو محفوظ بنانے اور اسے اسلامی سمندر بنا دینے پر مرکوز کر دی تاکہ پرتگال کے جہازوں کو اس سمندر تک پہنچنے سے روکا جا سکے۔ اس مقصد کے لیے اس نے اپنی کوشش یمن میں باب المندب کی تنگ آبنائے پر قبضہ کرنے پر مرکوز کر دی۔ اس ہدف کو حاصل کرنے کے لیے انھیں فطری طور پر یمن کی مقامی طاقتوں سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ اگلے مرحلوں میں ان کا ٹکراؤ بحر الکاہل اور خلیج عربی (خلیج فارس) تک محدود رہا۔ اس کے بعد پرتگالیوں نے بحیرۂ قلزم میں پہلے کی طرح داخل ہونے کی جرأت نہ کی۔ [3]

عثمانیوں کی مسلسل کوشش رہی کہ دشمن بحیرۂ احمر تک نہ پہنچ سکیں۔ اس کے بعد ان کا ٹکراؤ یہاں آخری ادوار میں پہلی جنگ عظیم سے پہلے اور اس کے دوران ہوا۔ تب خاص طور پر برطانیہ سے مقابلہ ہوا جو انیسویں صدی عیسوی میں اس خطے میں پہنچ چکا تھا۔ [4]

---

[1] صراع المسلمين مع البرتغاليين في البحر الأحمر: 99. [2] غسان الرمال کی مذکورہ بالا کتاب: 103۔ [3] غسان الرمال کی مذکورہ بالا کتاب: 203، و الدولة العثمانية دولة إسلاميه مفترٰى عليها: 863. [4] بحیرۂ قلزم پر برطانویوں کی عثمانیوں سے کشمکش کے بارے میں مزید معلومات کے لیے دیکھیے: ڈاکٹر عبداللطیف بن محمد الحمید کی الصراع بين الدولة العثمانية و بريطانيا في منطقة البحر الأحمر خلال الحرب العالمية الأولٰى: 1332-1337ھ مطابق 1914-1918ء.

الخليج العربي (خلیج فارس) میں کشمکش

عثمانی سلطنت کا دارالحکومت جزیرہ نمائے عرب کے مشرق سے نسبتاً دور تھا۔ اس کے باوجود اس کے پاس ایک بحری بیڑا موجود تھا جو دسویں صدی ہجری کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت کا بیڑا ہونے کی حیثیت سے اپنے فرائض ادا کرنے کی اہلیت رکھتا تھا اور یورپی حملوں کے خلاف اسلامی علاقوں کا دفاع کرسکتا تھا۔ مصر پر عثمانیوں کا قبضہ ہونے سے اسے ایک اہم بحری اڈہ مل گیا، یعنی سویز کی بندرگاہ جو بحیرۂ احمر (قلزم) اور خلیج عربی (خلیج فارس) میں جاری کشمکش کے دوران میں ایک اہم بحری فوجی اڈے کی حیثیت رکھتا تھا۔ علاوہ ازیں عثمانیوں کے عراق پر قبضے کی وجہ سے ان کی بحری افواج کے اثر و رسوخ میں اضافہ ہوگیا اور وہ ایسی قوت بن گئے جو خلیج کے شمالی حصے میں بصرہ کی بندرگاہ کے ذریعے سے خلیج فارس میں دشمنوں کا مقابلہ کرسکتی تھی۔ عثمانیوں نے ابتدائی مراحل ہی میں مشرق میں پرتگالیوں کا مقابلہ کرنا شروع کردیا تھا۔ ان کے بعض بیڑے 923ھ مطابق 1515ء ہی میں ہندوستان میں پرتگالیوں کے اڈوں پر حملے کرنے لگے تھے۔ [1]

لیکن یہ حملے پرتگالیوں کو خلیج میں اور جزیرہ نمائے عرب کے جنوبی حصے میں اپنے اڈے قائم کرنے سے نہ روک سکے، چنانچہ سابقہ کوششوں کے بعد پرتگالی کمانڈر ''بوقرق'' نے 1515ء مطابق 923ھ میں ہرمز (ایران) پر قبضہ کرلیا اور اسے پرتگالیوں کا مرکزی بحری اڈہ بنالیا۔ [2]

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خلیج اور جزیرہ نمائے عرب کے علاقے براہ راست ان کے خطرے کی زد میں آگئے۔ پرتگالیوں کا مقابلہ کرنے والے عثمانی سلاطین میں ''سلیمان قانونی'' سب سے مشہور ہے جس نے خلیج میں ان کا مقابلہ کرنے کے لیے مسلسل منظم بحری لشکر بھیجے۔ سب سے پہلا لشکر مصر کے گورنر سلیمان پاشا کی قیادت میں 930ھ (مطابق 1523ء) میں بھیجا گیا۔ اس کے بعد متعدد لشکر بھیجے گئے جن میں 945ھ (مطابق 1538ء) کا حملہ سب سے اہم ہے۔ وہ ستر جہازوں کا بیڑا لے کر سویز کے علاقے سے روانہ ہوا۔ ان پر بیس ہزار فوجی سوار تھے۔ اس میں بڑی بڑی توپیں بھی تھیں۔ اس فوج نے عدن اور مسقط فتح کرلیے اور ہرمز میں پرتگالیوں کا قلعہ فتح کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوئی۔ [3] ایک لشکر 958ھ مطابق 1551ھ میں کپتان ''پیری محی الدین رئیس'' کی قیادت میں خلیج کی طرف روانہ ہوا۔ یہ تیس جہازوں

---

[1] دليل الخليج، القسم التاريخي: 13/1، و تاريخ الدولة العثمانية: 325. [2] دليل الخليج (خلیج کی گائیڈ)، القسم التاريخي: 14/1. [3] تاريخ الدولة العلية: 241، و تاريخ الدولة العثمانية: 330.

عرب، شام و فلسطین اور عراق (مراد ثالث کے عہد میں)

پر مشتمل تھا جن پر تقریباً سولہ ہزار فوجی سوار تھے۔ یہ لشکر سویز سے روانہ ہوا۔ اس نے عدن میں پرتگیزوں سے سخت جنگیں کیں اور اسے ان سے خالی کروا لیا، پھر وہ مسقط کی طرف روانہ ہوا اور اس کا محاصرہ کر لیا حتی کہ وہاں کا پرتگالی حاکم ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوگیا۔ [1]

وہاں سے اس لشکر نے ہرمز کا رُخ کیا۔ وہاں کے پرتگالی حاکم ''الوارو ڈی نورنہا'' سے جنگ ہوئی۔ اس نے شہر پر قبضہ کر لیا مگر پرتگالی قلعہ بند تھا اور وہ ان تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہوا۔ پیری محی الدین وہاں سے بصرہ چلا گیا۔ [2] پرتگالیوں کے لیے ہرمز میں نئی کمک آ گئی جس سے انھیں خلیج فارس میں اپنی قوت دوبارہ مضبوط کرنے کا موقع مل گیا۔

سلیمان قانونی کے دور میں بصرہ کے گورنر مراد بک نے ایک بحری بیڑا تیار کر لیا تھا جس کے ذریعے سے اس نے خلیج میں پرتگالیوں سے کئی جنگیں لڑیں۔ ان میں سب سے اہم وہ لڑائی ہے جو 957ھ مطابق 1550ء میں قطیف کے قریب ہوئی، اس کے علاوہ اس نے 961ھ میں پرتگالی کمانڈر ''ڈیگوڈی نورنہا'' سے جنگ کی۔ اس جنگ میں عثمانیوں کو شکست ہوئی۔ اس سے پرتگالیوں کی ہمت بڑھی کہ وہ علاقے میں پہلے سے زیادہ اندر تک داخل ہو جائیں۔ [3]

---

[1] النفوذ البرتغالي في الخليج العربي: 146، و دليل الخليج، القسم التاريخي: 17/1. (عجیب بات یہ ہے کہ لوریمر نے پیری جیسے عثمانی کمانڈروں کو جو اسلامی سرزمین اور اسلامی سمندروں کا دفاع کر رہے تھے، بحری ڈاکو قرار دیا ہے۔) [2] دائرة المعارف الإسلامية: 11/9. [3] النفوذ البرتغالي في الخليج العربي: 149، و دليل الخليج العربي، القسم التاريخي: 17/1.

عثمانی سلطنت سلیم ثانی کے عہد (1566ء-1574ء) میں

لیکن اس شکست سے سلیمان قانونی کا عزم کمزور نہیں ہوا۔ اس نے پرتگالیوں کا مقابلہ کرنا بند نہیں کیا۔ تقریباً ایک سال بعد عثمانی بحریہ کے ایک کمانڈر ''سید علی رئیس'' کو اس مہم پر مقرر کیا۔ اس کمانڈر نے بصرہ میں ایک بحری بیڑا تیار کیا۔ وہ 962ھ میں خلیج میں حرکت میں آیا۔ ساحلِ عُمان کے قریب پرتگالی بیڑے سے اس کی بہت بڑی جنگ ہوئی۔ اگرچہ جہازوں کی تعداد کے لحاظ سے انھیں برتری حاصل تھی لیکن اس

قدیم تاروت قلعہ،قطیف(سعودی عرب)

نے انھیں شکست دے دی، چنانچہ پرتگالی میدانِ جنگ سے فرار ہونے پر مجبور ہوگئے۔عثمانیوں نے ان کا تعاقب کیا لیکن تیز ہواؤں کی وجہ سے ان کے جہاز بکھر گئے، اس لیے وہ اس مقابلے کے ذریعے سے اپنا مطلوبہ ہدف حاصل نہ کر سکے، یعنی یہ علاقہ پرتگالیوں سے پاک نہ ہوسکا۔عثمانیوں نے 966ھ (1559ء) میں پرتگالیوں اور ان کے مددگاروں سے بحرین میں ایک بڑی جنگ لڑی۔ بارہ سو عثمانی فوجیوں نے ایک جنگی چال چل کر پرتگالیوں کے ستر فوجی قتل کر دیے۔تب پرتگالیوں کو ہرمز اور بعض دوسرے فوجی اڈوں سے مزید فوج طلب کرنی پڑی۔انھوں نے عثمانیوں کو ایک بار پھر بحرین سے پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔[1]

بعد میں جب خلیج میں پرتگالی اثر و رسوخ کم ہوگیا تو وہاں بعض دوسری یورپی اقوام میں مقابلہ بازی شروع ہوگئی، یعنی ہالینڈ، برطانیہ اور فرانس نے اس علاقے تک پہنچنے اور اپنا اپنا حلقۂ اثر بڑھانے کی کوششیں شروع کر دیں۔آخر میں حالات برطانیہ کے حق میں ہوگئے۔اس نے اپنے مرکزی اڈے قائم

[1] دليل الخليج، القسم التاريخي:1/18.

کرنے شروع کر دیے۔ اس نے ہندوستان پر قبضہ کرنے کے بعد علاقے میں اپنی طاقت میں اضافہ کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ انگریزوں نے 1032ھ (مطابق 1622ء) میں ہرمز پر قبضہ کر کے پرتگالیوں کو وہاں سے نکال دیا۔ اس سلسلے میں ان سے صفویوں نے تعاون کیا۔ انھوں نے عثمانیوں کی راہ روکنے کے لیے پہلے پرتگالیوں سے، پھر برطانویوں سے تعاون کیا۔ اس طرح خلیج میں یورپی اقوام کی قیادت برطانیہ کو حاصل ہوگئی۔ [1]

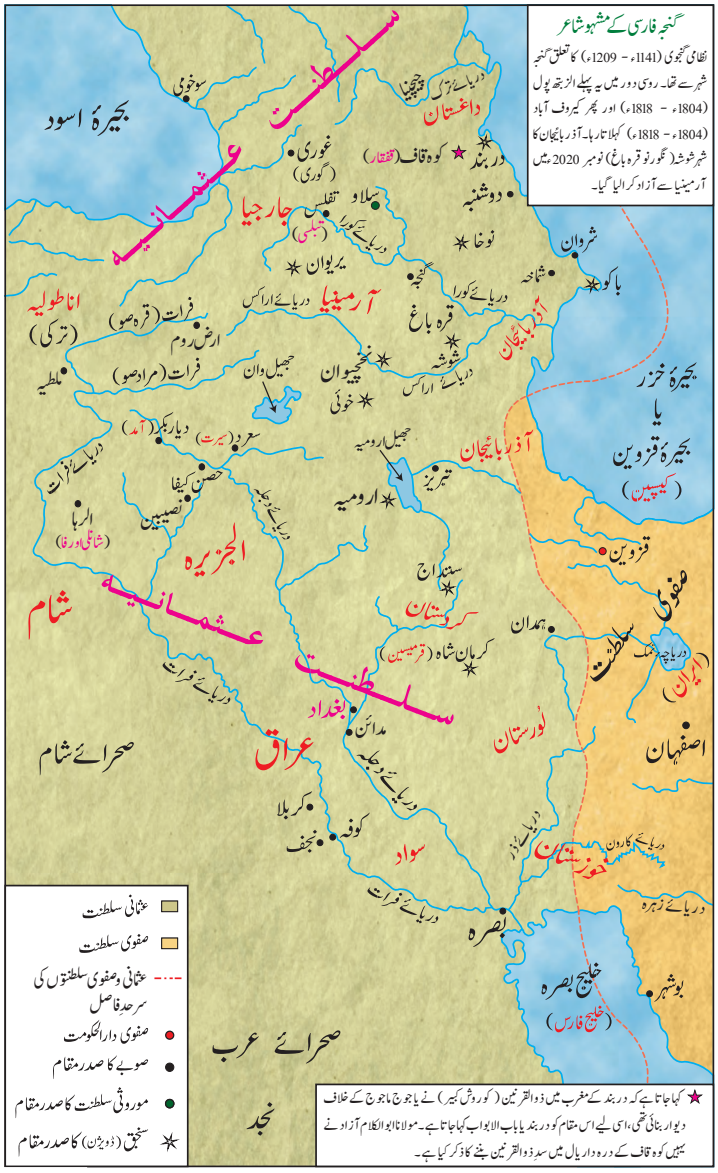

خلیفہ مراد ثالث کے عہد (95-1574ء) میں ولایت قفقاز و فارس

اس کے بعد عثمانی سلطنت کچھ اور مسائل میں الجھ گئی، اس لیے خلیج کی طرف اس کی توجہ کم ہوگئی۔ اس کے بعد ضعف کے مراحل میں اس کی زیادہ توجہ صفویوں سے کشمکش پر رہی، چنانچہ اس دوران میں یورپی اقوام نہ صرف خلیج میں موجود رہیں بلکہ انھوں نے عثمانی سلطنت کے اندر بھی عثمانیوں کے ماتحت علاقوں،

[1] دليل الخليج، القسم التاريخي: 46/1.

مثلاً: عراق وغیرہ میں اپنا اثر و رسوخ بڑھا لیا۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے تجارت، بین الاقوامی معاہدوں اور اس طرح کے دوسرے حالات سے فائدہ اٹھایا جو اس عرصے میں پیش آئے۔ [1]

بعد میں عثمانی سلطنت کو قطر اور احساء وغیرہ کے علاقے اپنے دائرہ اختیار میں لانے پڑے۔ 1274ھ (مطابق 1871ء) سے وہاں عثمانی محافظ افواج رکھی گئیں لیکن برطانیہ نے تنبیہ کی کہ بحرین میں مداخلت نہ کی جائے اور اس کے اڈوں اور بحری راستوں کو خطرے میں نہ ڈالا جائے۔ [2]

اس کے بعد فریقین میں مذاکرات ہوتے رہے حتی کہ پہلی جنگ عظیم شروع ہوگئی۔ جنگ کے بعد یورپ نے عثمانی سلطنت کا ترکہ آپس میں بانٹ لیا اور عرب دنیا جو اس دور میں سلطنت عثمانیہ کے تابع تھی، کے اکثر حصوں پر براہِ راست قبضہ کر لیا کیونکہ سلطنتِ عثمانیہ کے سقوط کے بعد یورپ کی استعماری طاقتوں کا مقابلہ کرنے والا کوئی نہیں رہا تھا۔

---

[1] دليل الخليج، القسم التاريخي: 360/1، و تاريخ الدولة العلية: 670. [2] دليل الخليج، القسم التاريخي: 382/1، و علاقة ساحل عمان ببريطانيا: 286.

بحر ابیض متوسط (بحیرۂ روم) کا ساحل اور شمالی افریقہ

جب اندلس میں مسلمانوں کا آخری مرکز غرناطہ چھن جانے کا المیہ پیش آیا تو عرب دنیا کے مغربی حصے اور شمالی افریقہ کے ممالک اہلِ یورپ کی دست درازیوں اور فوج کشی کی کوششوں سے محفوظ نہ رہے، چنانچہ ان علاقوں میں مسلمانوں پر ضرب لگانے کی کوشش کی گئی۔ اگرچہ اسلامی دنیا کے اس حصے میں متعدد اسلامی ریاستیں بکھری ہوئی تھیں لیکن وہ کمزور ریاستیں تھیں۔ ان میں یورپی حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے کی سکت نہ تھی، حالانکہ وہاں کے عوام اہل یورپ سے جہاد کرنے اور انھیں مغرب (مراکش وغیرہ) کی سرزمین سے دور ہٹانے کا جذبہ رکھتے تھے بلکہ وہ چاہتے تھے کہ مقبوضہ اندلس پر حملہ کیا جائے جو اس وقت مسلمانوں سے چھن چکا تھا۔ ان پُرخطر حالات میں عثمانی حکومت کے لیے ضروری ہوگیا تھا کہ ہسپانوی اور یورپی حملہ آوروں کو روکنے اور علاقے کے مسلمانوں کی مدد کرنے کے لیے مداخلت کرے۔ [1]

سلطان سلیم نے بعض ایسے جہاز رانوں سے مدد لی جو اس سے پہلے ممالیک سے تعاون کرتے رہے تھے۔ ان کا تعلق بحر ابیض متوسط (بحیرۂ روم) میں موجود بحری فوج سے تھا۔ ان میں ایک جہاز ران خیرالدین باربروسا بھی تھا۔ دوسرا اس کا بھائی عروج تھا۔ سلطان نے انھیں جہاز اور سپاہی مہیا کیے۔ ان سے کہا کہ وہ موجودہ تیونس اور الجزائر کے سامنے اسلامی ساحلوں پر ہسپانویوں کو چیلنج کریں اور الجزائر کے ساحل پر دشمن نے جن مقامات پر قبضہ کیا ہے، انھیں آزاد کرائیں۔ انھوں نے بحیرۂ روم میں کچھ یورپی جہازوں کے راستے میں رکاوٹ ڈالی۔ اس کے علاوہ الجزائر کے سمندر میں بعض جزیروں کو آزاد کرا لیا۔ عروج نے الجزائر میں ہسپانویوں سے جنگ کرتے ہوئے 922ھ مطابق 1516ء میں ایک معرکے میں شہادت پائی۔ [2]

خیرالدین فرنگیوں کے جہازوں پر حملے کرتا رہا بلکہ سلیمان قانونی کے ایام میں اس نے اٹلی، فرانس اور سپین کے ساحلوں پر اپنی فوجیں اتار دیں اور وہاں کے ان فوجی اڈوں کو نقصان پہنچایا جہاں سے جہاز چل کر شمالی افریقہ پر حملے کرتے تھے۔ ان کارناموں کی عالم اسلامی میں بلکہ یورپ میں بھی بہت شہرت ہوئی۔ اس کے ساتھ ساتھ خیرالدین کا خیال تھا اور اسے استنبول کی حمایت بھی حاصل تھی کہ اندلس کو ان ہسپانویوں سے نجات دلائی جائے جنھوں نے مسلمانوں کو وہاں سے نکالا تھا، چنانچہ وہ کئی مرتبہ ہسپانویوں

---

[1] عادل سعید بشتاوی کی الأندلسیون الموارکة: 117، و الدولة العثمانیة دولة إسلامیة مفتری علیها: 64/2.

[2] تاریخ الدولة العثمانیة: 252، و تاریخ الدولة العلیة: 230، و خیرالدین بربروس: 102.

براعظم افریقہ (1566ء میں)
سلطنت عثمانیہ
عثمانی دار السلطنت
صفوی سلطنت
صفوی دار السلطنت
بحر اوقیانوس شمالی
بحر اوقیانوس جنوبی
بحر ہند
بحر ہند
یورپ
ایشیا
روس
فن لینڈ
ناروے
سویڈن
ڈنمارک
انگلستان
بحیرۂ شمالی
جرمنی
پولینڈ
ہالینڈ
فرانس
ہسپانیہ
پرتگال
اٹلی
ماسکو
ہنگری
بوڈا
کریمیا
بحیرۂ اسود
استنبول
(قسطنطنیہ)
سلطنت عثمانیہ
میڈرڈ
بارسلونا
مارسیلز
نیس
الجزائر
تونس
سسلی
مالٹا
بحیرۂ روم
طنجہ
فاس
مراکش
تلمسان
طرابلس
بن غازی
اسکندریہ
قاہرہ
لیبیا (طرابلس)
صحرائے اعظم
ولایت الجزائر
ولایت مصر
شام
دمشق
بغداد
تبریز
قازاقستان
ترکستان
ایران
سلطنت صفوی
ایشیا
حجاز
نجد
عرب
سلطنت
یمن
صنعا
خلیج عدن
سلطنت فاس
سنگھوئی حبشی سلطنت
(فاس کی باجگزار)
ٹمبکٹو
مملکت ہوسا
مملکت بورنو
سلطنت عثمانیہ
اسوان
سواکن
بحیرۂ احمر
عثمانیہ
سوڈان
مصوع
براعظم افریقہ
حبشہ
(ایتھوپیا)
ادیس ابابا
صومالیہ
گنی
خلیج گنی
وسطی افریقہ
کا
نامعلوم خطہ
دریائے کانگو
کانگو
کینیا
جھیل وکٹوریہ
ممباسہ
دار السلام
ٹانگانیکا
(تنزانیہ)
قمر (کومورو)
زیمبیا
دریائے زیمبزی
موزمبیق
مڈغاسکر
نامعلوم سرزمین
دریائے اورنج
جنوبی افریقہ
راس اُمید

سے جنگیں کر کے اندلس کے ہزاروں مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کو چھڑا کر اپنے جہازوں میں لے آیا۔ اس طرح اس نے ان مسلمانوں کو ہسپانویوں کے ہاتھوں زندہ جلا دیے جانے سے بچا لیا۔ وہ بڑی بے دردی سے مسلمانوں کو جلا دیتے تھے۔ [1]

یہ سب کارروائی عثمانی سلطان ''سلیمان قانونی'' کے نام سے انجام دی جاتی تھی جس نے خیرالدین کو عثمانی بحری افواج کا چیف کمانڈر مقرر کیا تھا اور اسے یہ عہدہ سنبھالنے کے لیے استنبول آنے کی دعوت دی تھی، چنانچہ خیرالدین نے اپنے بیٹے کو اپنا قائم مقام مقرر کیا اور مغربی محاذ چھوڑ کر حکم کی تعمیل میں استنبول روانہ ہوگیا۔ [2] وہ الجزائر سے استنبول آتے ہوئے سپین کے زیرِ قبضہ ساحل سے گزرا تو وہاں ایک بڑی بحری لڑائی ہوئی اور اس نے بڑی تعداد میں سپین کے جہازوں پر قبضہ کر لیا۔ [3]

یہ مجاہد میدان سے زیادہ عرصہ غیر حاضر نہیں رہا بلکہ ایک بار پھر میدانِ جہاد میں آ گیا۔ اس نے شمالی افریقہ پر یورپی حملے کا مقابلہ کیا اور 941ھ مطابق 1535ء میں تیونس کے علاقے میں ہسپانویوں کے خلاف بڑی بڑی جنگوں میں حصہ لیا لیکن علاقے کے بعض لوگوں نے ہسپانویوں سے تعاون کیا جس کی وجہ سے اسے پیچھے ہٹنا پڑا۔ ہسپانویوں نے ایسے جرائم کا ارتکاب کیا جن کی مثال نہیں ملتی، چنانچہ انھوں نے تیس ہزار سے زیادہ مردوں کو قتل کر دیا اور دس ہزار سے زیادہ خواتین کو گرفتار کر لیا اور متعدد کتب خانوں اور مساجد کو آگ لگا دی۔ [4]

945ھ مطابق 1538ء میں پوپ نے خیرالدین کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک صلیبی بحری بیڑا تیار کیا۔ تیاری مکمل ہونے پر پوپ نے ایک فرمان جاری کیا جسے تمام یورپی ممالک میں نشر کیا گیا۔ اس فرمان میں اس نے اعلان کیا کہ یہ لشکر صلیبی لشکر ہے۔ مسیح پر ایمان رکھنے والے، نصرانیت کے ساتھ مخلص ہر شخص کے لیے ضروری ہے کہ اس میں شامل ہو کر کافروں سے جنگ میں شریک ہو۔ [5]

خیرالدین تھوڑی مدت میں اس پاپائی بیڑے کو نقصان پہنچانے میں کامیاب ہوگیا جس میں اٹلی، سپین اور پوپ کے بحری جہاز شامل تھے۔ اس نے ان سے ایک شدید بحری جنگ کی جس میں عثمانی بحری بیڑے کو فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی۔ اس پر عثمانی سلطنت کے طول وعرض میں اظہارِ مسرت کے لیے تقریبات منعقد

---

[1] تاریخ الدولة العثمانية: 257، و خیرالدین بربروس: 126. [2] تاریخ الدولة العثمانية: 258، و خیرالدین بربروس: 127، و تاریخ الدولة العلية: 231. [3] تاریخ الدولة العثمانية: 290، و خیرالدین بربروس: 131. [4] دیکھیے: یلماز اوزتونا کی مذکورہ بالا کتاب: 393، و تاریخ الدولة العلية: 233. [5] خیرالدین بربروس: 150.

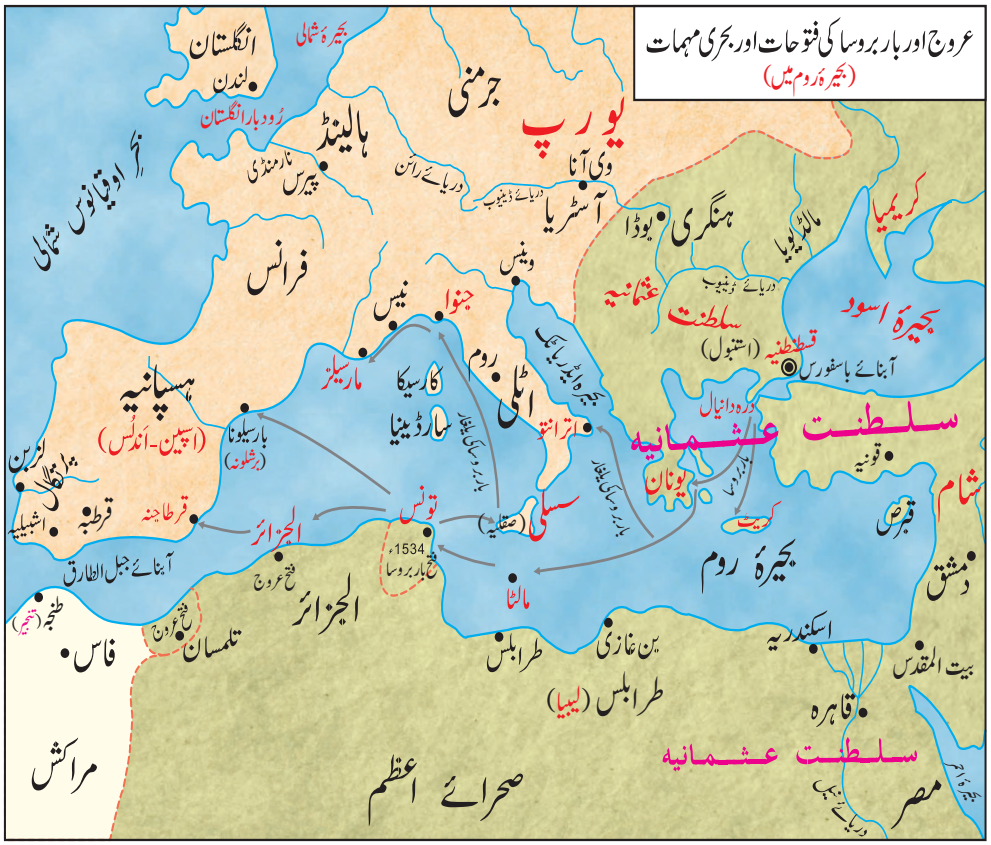

کی گئیں۔ اس معرکے کے بعد عثمانی بیڑے کو بحر ابیض متوسط (بحیرۂ روم) پر مکمل تسلط حاصل ہو گیا۔ [1]

اس معرکے کے بعد یورپی افواج نے الجزائر میں عثمانی بیڑے پر حملہ کرنے کی کوشش کی لیکن عثمانی بحریہ کے کمانڈر ان کی تاک میں تھے، چنانچہ انھوں نے دوبارہ یورپیوں کو شکست دے دی۔ انھوں نے اس پر بس نہیں کی بلکہ طرابلس الغرب (لیبیا) کے گرد و نواح میں بعض عیسائی مقبوضات پر حملے کر کے انھیں آزاد کروا لیا۔ اس کے علاوہ عثمانیوں نے بحیرۂ روم کے بعض جزیرے بھی یورپی تسلط سے چھڑا لیے۔ [2]

خیر الدین اور اس کے ساتھی بحیرۂ روم میں مسلسل بحری جہاد کرتے رہے۔ وہ دشمن کی افواج کو کمزور کرتے، سمندر میں جہازوں پر حملے کرتے اور انھیں بڑے نقصان سے دوچار کر دیتے تھے۔ یورپیوں کی نظر میں وہ ڈاکو تھے لیکن حقیقت میں انھوں نے ان کارروائیوں کے ذریعے سے الجزائر اور قرب و جوار کے ساحلوں کو اصل ڈاکوؤں، یعنی حملہ آور یورپیوں سے محفوظ رکھا جو ان مقامات پر قبضہ کر کے وہاں سے

---

[1] العثمانيون في التاريخ والحضارة: 99. [2] العثمانيون في التاريخ والحضارة: 99.

اسلام کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ خیرالدین نے شمالی افریقہ میں اپنے دشمن عیسائیوں سے جو جہاد کیا اس کی وجہ سے ان علاقوں میں عثمانی سلطنت کا وجود باقی رہا۔[1]

شمالی افریقہ کی مسلمان اقوام آج بھی خیرالدین، اس کے ساتھیوں اور اس کے لشکر کو فخر کی نگاہ سے دیکھتی ہیں اور انھیں اندلس پر ہسپانویوں کا قبضہ ہو جانے کے بعد مسلمانوں اور عیسائیوں کی کشمکش کے نازک مرحلے میں مجاہدین کی ایک دلکش مثال سمجھتی ہیں۔

④ عثمانیوں کا روس سے جہاد

عثمانی سلطنت نے دسویں صدی ہجری میں یورپ کے مختلف حصوں میں جہاد کیا۔ سلیمان قانونی نے ویانا کا محاصرہ کر کے وسطی اور مغربی یورپ کو خوف زدہ کر دیا، چنانچہ عیسائی یورپ نے اپنے مشرقی اور مغربی ممالک سے عثمانی سلطنت کے خلاف مدد مانگی۔ روس کی زار شاہی حکومت اس وقت بھی اور بعد کے ایام میں بھی عثمانی سلطنت سے مزاحمت کی کوشش کرتی رہی۔ یہ مزاحمت براہِ راست بھی تھی اور بلقان وغیرہ میں عثمانیوں کے مخالفین کی مدد کرنے کی صورت میں بھی تھی، خاص طور پر عثمانی سلطنت کے آخری دور میں جب اس میں کمزوری آنا شروع ہوگئی تھی۔

بارہویں صدی ہجری (سترہویں صدی عیسوی) میں روس نے پطرس (پیٹر اعظم) کی قیادت میں اپنے قریبی علاقوں میں سرگرمی سے پاؤں پھیلانے شروع کر دیے۔ وہ یورپ سے عثمانیوں کو نکالنے کے لیے عیسائی تحریک کی قیادت کر رہا تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے یورپ کا دورہ کیا۔ اس کے دور حکومت میں روس نے اس مقصد کے حصول کے لیے تیاری کی۔ اس نے بلقان، قفقاز (کوہ قاف) اور قرم (کریمیا) کے علاقوں میں عثمانی سلطنت سے بغاوت کرنے والوں کی مدد کے لیے مداخلت کرنے کی کوشش کی۔

پیٹر اعظم[2] نے بحیرۂ اسود پر عثمانی بندرگاہ ''ازوف'' پر قبضہ کرنے کی کوشش کی اور طویل عرصے تک اس کا محاصرہ جاری رکھا حتی کہ 1107ھ (1695ء) میں اس پر قبضہ کر لیا۔[3]

---

[1] تاریخ الدولة العثمانية: 303، و تاریخ الدولة العلية: 230، و خیرالدین بربروس: 118. [2] پیٹر نے 1695ء میں 60 ہزار فوج کے ساتھ ازوف کا آن محاصرہ کیا جو ناکام رہا اور پیٹر 30 ہزار روسی سپاہیوں کی لاشیں چھوڑ کر پسپا ہو گیا لیکن دوسرے سال اس نے تازہ فوج کے ساتھ شہر کا محاصرہ کیا۔ روسی بیڑے نے عثمانی بیڑے کو شکست دی۔ اب کے محاصرہ کامیاب رہا اور 28 جولائی 1696ء کو ازوف نے ہتھیار ڈال دیے۔ (دولتِ عثمانیہ، ڈاکٹر عزیر احمد: 282/1) [3] تاریخ الدولة العلية: 309، و تاریخ الدولة العثمانية: 572، و العثمانیون والروس: 75.

1123ھ (1711ء) میں عثمانیوں اور روسیوں میں ''ازوف'' کے قریب ایک نئی جنگ چھڑ گئی۔ اس جنگ میں عثمانی لشکر کا سالار صدر اعظم ''بلطہ جی محمد پاشا'' تھا جس نے روسی افواج اور ان کی قائم کی ہوئی قلعہ بندیوں اور خندقوں کو تباہ کر دیا۔ عثمانیوں نے زور دار حملے کیے جن کے نتیجے میں عثمانیوں کو فتح ہوئی اور ہزاروں روسی سپاہی ہلاک ہو گئے۔ [1]

دونوں ملکوں میں 1125ھ (1713ء) میں ایک اور جنگ ہوئی جس کے بعد فریقین میں ہونے والے معاہدے کے تحت روسیوں نے بحیرۂ اسود سے متصل بہت سے عثمانی علاقے حاصل کر لیے۔ [2]

---

[1] تاريخ الدولة العثمانية: 597، و تاريخ الدولة العلية: 313، و العثمانيون والروس: 76. [2] تاريخ الدولة العثمانية: 597، و تاريخ الدولة العلية: 314.

لالہ مصطفیٰ پاشا مسجد، فاماگستا (قبرص)

عثمانیوں اور روسیوں کی جنگوں پر ان جنگوں کا بہت اثر پڑتا تھا جو عثمانی سلطنت اور اس کے یورپی دشمنوں میں ہوتی تھیں، چنانچہ عثمانیوں کی فتح سے روس پر دباؤ پڑتا تھا اور انھیں عثمانیوں کے حق میں بعض علاقوں سے دست بردار ہونا پڑتا تھا۔ اسی طرح اس کی برعکس صورت بھی درست ہے۔ اس کے نتیجے میں 1152ھ (مطابق 1739ء) میں روسیوں کو جھکنا پڑا اور انھوں نے بحیرۂ اسود کے کئی مقبوضہ علاقے عثمانیوں کو واپس کر دیے۔ انھوں نے وہاں جو قلعہ بندیاں قائم کی تھیں، وہ گرا دیں۔ یہ اس معاہدے کے تحت ہوا جو ''معاہدۂ بلغراد'' کے نام سے معروف ہے۔ [1]

1184ھ (1770ء) میں کچھ اور جنگیں بھی ہوئیں جن میں ایک طرف عثمانی تھے اور دوسری طرف روس اور اس کی مدد کرنے والی یورپی افواج تھیں۔ یہ جنگیں یونان کے قریب بعض جزیروں کی وجہ سے ہوئیں، ان میں کوئی فریق غالب نہ آ سکا۔ اس کے علاوہ روسیوں نے ''طرابزون'' (مشرقی ترکی) وغیرہ پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ عثمانی انھیں روکنے میں کامیاب رہے اگرچہ انھوں نے سمندر کی طرف سے خود استنبول کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔ [2]

اس عرصے میں کئی بار کوشش کی گئی کہ عثمانی سلطنت اور ملکۂ روس کیتھرائن کے درمیان جنگ بندی کا

---

[1] تاريخ الدولة العثمانية: 611، و العثمانيون والروس: 79. [2] تاريخ الدولة العثمانية: 625، و تاريخ الدولة العلية: 336.

قلعہ بلغراد (سربیا) میں زندان گیٹ یا ''زندان کپیجہ'' کا فضائی منظر

معاہدہ ہو جائے لیکن کیتھرائن کی ضد اور سخت شرائط کی وجہ سے کوئی کوشش کامیاب نہ ہوسکی، چنانچہ روسیوں اور عثمانیوں میں نئے سرے سے جنگ چھڑ گئی۔ فریقین میں ڈینیوب کے علاقے میں کئی شدید معرکے ہوئے جن میں عثمانیوں کو شاندار فتح حاصل ہوئی۔ ایک معرکے میں آٹھ ہزار سے زیادہ روسی فوجی ہلاک ہوئے اور باقی شکست کھا کر پلٹ گئے لیکن وہ جہاں جہاں سے گزرے، بہت سے مسلمان معمر مردوں، خواتین اور بچوں کو شہید کر گئے۔ ان معرکوں میں عثمانی افواج کا سالار ''عثمان پاشا'' تھا۔ ان فتوحات کے نتیجے میں اسے ''غازی'' کا لقب دیا گیا۔[1]

1187ھ (1773ء) میں روسی افواج پھر عثمانی علاقے میں گھس آئیں اور دریائے ڈینیوب کو پار کرلیا۔ ان

[1] العثمانیون والروس:82، وتاریخ الدولة العلیة:337، وتاریخ الدولة العثمانیة:627.

کا مقابلہ عثمانی کمانڈر ''آفندی عبدالرزاق'' کی زیر قیادت افواج سے ہوا۔ روسیوں نے عثمانی افواج کو شکست دے دی۔ تب فریقین میں مذاکرات ہوئے جن کے نتیجے میں 16 جولائی 1774ء کو ایک نیا معاہدہ ہوا جسے ''معاہدہ کینارجی'' کہتے ہیں۔ اس میں روسیوں کو عثمانی علاقوں اور عثمانی سمندروں پر بہت سے حقوق حاصل ہوگئے۔ انھیں عثمانی سمندروں میں جہاز رانی اور عثمانی بندرگاہوں سے گزرنے کا حق مل گیا[1] اور عثمانی سلطنت کے زیر انتظام بعض خطوں میں گرجا گھر تعمیر کرنے اور ان کی حفاظت کرنے کا حق بھی حاصل ہوگیا۔[2]

ان معاہدوں کے باوجود روسیوں کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی تھی کہ ہمسایہ اسلامی علاقوں کو ان کی مختلف اقوام سمیت ہڑپ کر لیا جائے۔ انھوں نے کریمیا کے علاقے میں مداخلت کا جواز پیدا کرنے کے لیے وہاں شورش برپا کرنے کی متعدد کوششیں کیں، پھر اس علاقے میں داخل ہو کر اس پر قبضہ کر لیا۔ اگرچہ عثمانی سلطنت ان علاقوں کو روسی قبضے سے چھڑانے کے لیے مسلسل کوشش کرتی رہی لیکن دوسرے یورپی ممالک نے فوجی اور سیاسی طور پر مسلسل دباؤ ڈال کر عثمانی سلطنت کو مجبور کر دیا کہ وہ موجودہ صورتِ حال کو قبول کر لے اور اس علاقے پر روسی قبضے پر خاموشی اختیار کرے۔[3]

عثمانیوں اور روسیوں کے تعلقات میں اتار چڑھاؤ آتے رہے۔ روسی ان تحریکوں کی حمایت کرتے تھے جن کا مقصد عثمانی سلطنت کو ختم کر کے دوبارہ بازنطینی سلطنت قائم کرنا تھا جبکہ تیرہویں صدی ہجری کے شروع میں عثمانی سلطنت مشکل حالات سے گزر رہی تھی۔ اس دوران میں مختلف عثمانی سلاطین کی حکومت رہی جن کی پالیسیاں ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ روسیوں سے تصادم بھی مسلسل جاری تھا۔ اس کے علاوہ دوسرے یورپی ممالک کے ساتھ بھی کئی مسائل پیدا ہوگئے جو نہ صرف یورپ میں بلکہ مغربی مسلم ممالک، یعنی افریقہ، بالخصوص مصر میں عثمانی سرزمین پر قبضہ کرنے کی خواش رکھتے تھے۔ انقلاب فرانس کے بعد روس، فرانس اور برطانیہ کی استعماری تحریکوں کی صورت میں یورپ متحرک ہو چکا تھا۔ علاوہ ازیں ان ایام میں عثمانی سلطنت کئی اندرونی مسائل کا شکار تھی، حالانکہ بعض عثمانی سلاطین اور

---

[1] روس اور دولت عثمانیہ کے تجارتی جہازوں کو ان سمندروں میں جو ان سلطنتوں کے کنارے (درمیان) واقع تھے (یعنی بحیرۂ ازوف اور بحیرۂ اسود) آمد و رفت کی پوری آزادی دی گئی۔ (دولت عثمانیہ، ڈاکٹر عزیر احمد: 351) گویا آبنائے باسفورس، بحیرۂ مرمرہ اور بحیرۂ ایجین میں روسیوں کو داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ (م ف) [2] تاريخ الدولة العثمانية: 628، و تاريخ الدولة العلية: 342، و العثمانيون و الروس: 82. [3] العثمانيون و الروس: 89، و تاريخ الدولة العثمانية: 231.

کمانڈروں نے ان مسائل پر قابو پانے کی کوشش بھی کی تھی۔ اس مشکل دور میں عثمانی سلطنت کمزور ہوتی گئی اور روسی شہنشاہیت مضبوط ہوتی گئی۔ خاص طور پر نپولین سے جنگوں کے بعد اس کی قوت میں اضافہ ہوگیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ عثمانیوں پر شیر ہونے لگی جو کئی سال تک ایران سے جنگوں میں الجھے رہے تھے۔ [1]

1226ھ (مطابق 1811ء) میں رومانیہ سے متصل علاقے میں روسیوں اور عثمانیوں میں کئی جنگیں ہوئیں کیونکہ روس نے اس خطے میں بعض عثمانی شہروں پر قبضہ کرنے کی کوشش کی اور شروع میں وہ کامیاب بھی ہوئے لیکن پھر عثمانیوں نے کئی جنگیں لڑ کر وہ شہر ان سے واپس لے لیے اور روسیوں کو علاقے خالی کرنے پر مجبور کر دیا۔ [2]

1243ھ مطابق 1827ء میں یونانیوں نے عثمانی سلطنت کے خلاف کچھ یورشیں برپا کیں۔ عثمانی کمانڈر ابراہیم پاشا نے ان پر کامیابی سے قابو پا لیا، چنانچہ روس نے عثمانی سلطنت کے خلاف برطانیہ، فرانس اور پروشیا (جرمنی) کے ساتھ اتحاد کر لیا تاکہ اسے یونان سے بے دخل کیا جا سکے۔ ان ممالک کے بحری بیڑوں نے مل کر یونان میں عثمانی جہازوں پر حملہ کر دیا۔ چونکہ یہ حملہ غیر متوقع تھا، اس لیے انھوں نے مختصر وقت میں انھیں مکمل طور پر تباہ کر دیا۔ عثمانی بیڑے کی تباہی کا فائدہ سب سے زیادہ روس کو ہوا جو موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے پہلے ہی تیار تھا، چنانچہ اس نے عثمانی علاقے میں پیش قدمی کی اور افلاق، یعنی ولاچیا (رومانیہ) کے دارالحکومت بخارسٹ پر قبضہ کر لیا۔ علاوہ ازیں وارنا اور یاشی (Iasi) وغیرہ عثمانی شہروں پر بھی قبضہ کر لیا جو آج کل بلغاریہ اور رومانیہ میں واقع ہیں۔ ان علاقوں میں جنگ 1245ھ تک جاری رہی۔ آخر کار روس کو فتح ہوئی۔ اس کے باوجود عثمانیوں نے روسیوں کو شدید نقصان پہنچایا۔ اس جنگ کا خاتمہ ''معاہدہ ادرنہ'' پر ہوا جس میں روس کو کئی رعایتیں حاصل ہوئیں اور فریقین میں نئے سرے سے سرحدوں کا تعین کیا گیا۔ [3]

اس معاہدے کے باوجود روسی اور عثمانی (دونوں فریق) مناسب موقع کے انتظار میں رہے۔ ان میں بعض لڑائیاں بھی ہوئیں۔ روس کی کوشش تھی کہ موقع سے فائدہ اٹھا کر عثمانیوں پر حملہ کر دے اور مشرقی یورپ میں عثمانیوں کے بعض علاقوں پر قبضہ کر لے۔ اس وجہ سے دوسری یورپی اقوام روس کی قوت میں

---

[1] تاريخ الدولة العثمانية: 623-648، و الحروب العثمانية الفارسية و أثرها على المد الإسلامي في أوربا. طبع دار الصحوة قاهرة، 1408ھ. [2] العثمانيون و الروس: 98، و تاريخ الدولة العلية: 401. [3] تاريخ الدولة العلية: 431، و العثمانيون و الروس: 102-104.

وچاؤ (آسٹریا) میں قدیم ایگشٹائن قلعہ اور دریائے ڈینیوب غروبِ آفتاب کے وقت

اضافہ ہوتا دیکھ کر خطرہ محسوس کرنے لگیں، چنانچہ فرانس اور برطانیہ میں روس مخالف احساسات بیدار ہونے لگے کیونکہ یہ دونوں ملک بھی عثمانی سلطنت کے بعض علاقوں پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ چونکہ عثمانی سلطنت کمزوری کے مرحلے سے گزر رہی تھی، اس لیے یہ ممالک اس کے علاقے تقسیم کرنے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے لگے تھے۔ اسی وجہ سے برطانیہ اور فرانس نے فوراً عثمانیوں سے ہمدردی کا اظہار کیا اور خواہش ظاہر کی کہ وہ عثمانی سلطنت کی سرزمین کی حفاظت اور روس کا مقابلہ کرنے کے لیے اس کی مدد کرنا چاہتے ہیں، چنانچہ 55-1853ء کی جنگِ کریمیا میں ان ممالک نے روس کے خلاف جنگ میں عثمانیوں کا ساتھ دیا۔ جولائی 1853ء میں روسی فوجیں مولڈیویا اور ولاچیا پر قابض ہوگئیں، تاہم عثمانی فوج نے عمر پاشا کی قیادت میں بڑی بہادری سے جنگ کی اور ''اولٹنزا'' شہر کے پاس روسیوں کو شکست سے دوچار کیا،

ٹرانسلوینیا (رومانیہ) کا قلعہ سیغی سوارا

چنانچہ روسیوں کو بھاگنا پڑا۔ ان کا سپہ سالار بھاگنے میں سب سے آگے تھا۔ عثمانیوں نے ان کا خاتمہ کرنے کے لیے ان کا تعاقب کیا لیکن عثمانی سلطنت کے یورپی حلیفوں نے، جن میں آسٹریا کی فوجیں سب سے نمایاں تھیں، انھیں منع کر دیا۔ یورپیوں نے نہ صرف عثمانیوں کو روس پر یقینی فتح حاصل کرنے سے روکا بلکہ خود آسٹریا والوں نے بغدان (مالڈووا) اور افلاق (ولاچیا) پر قبضہ کر لیا۔ اسی طرح عثمانیوں نے کچھ علاقے روس کے قبضے میں جانے سے بچائے لیکن پھر آسٹروی ان پر قابض ہو گئے۔ عثمانیوں نے اسے مجبوراً تسلیم کر لیا تاکہ تعاون کا معاہدہ ختم نہ ہو جائے اور ایک نئی جنگ شروع نہ ہو جائے۔

مارچ 1854ء میں برطانیہ اور فرانس نے روس کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ انھوں نے اپنی افواج بلغاریہ اور کریمیا میں بھیج دیں۔ اتحادیوں نے سباستوپول (کریمیا) کا ایک سال محاصرہ کیے رکھا حتی کہ

8 ستمبر 1855ء کو روسیوں نے ہتھیار ڈال دیے۔

اس دوران میں عثمانیوں کے حلیف یورپیوں کی جنگ کا میدان روس کے شمالی ساحلوں پر منتقل ہوگیا تھا۔ 1270ھ (مطابق 1853ء) میں ''سینٹ پیٹرز برگ'' کے شہر کے قریب سمندری جنگیں ہوئیں اور حلیفوں نے بحیرہ بالٹک میں بعض روسی بندرگاہوں پر قبضہ کرلیا، پھر انھوں نے دوسرے محاذوں پر پیش قدمی کی حتی کہ محسوس ہونے لگا کہ وہ ''کیف'' پر بھی قبضہ کر لیں گے۔ اس وجہ سے روسیوں نے جنگ پر مذاکرات کو ترجیح دی۔ مذاکرات میں حلفاء (اتحادی) اور عثمانی ایک فریق تھے اور روسی دوسرا فریق تھے۔ اسی سال مختلف فریقوں میں ''معاہدہ پیرس'' انجام پا گیا۔ [1]

اس طرح روسیوں اور عثمانیوں کی جنگ وقتی طور پر بند ہوگئی جبکہ عثمانی سلطنت اور اس کی املاک پر روس اور یورپ کی لالچ بھری نظریں لگی ہوئی تھیں، چنانچہ وہ تمام ممالک مل کر عثمانی سلطنت کے لیے طرح طرح کی مشکلات کھڑی کرنے لگے۔ [2]

اس مقصد کے لیے انھوں نے سلطنتِ عثمانیہ میں نسلی اور مذہبی اقلیتوں اور شورشوں کو مدد دینی شروع کردی۔ اس کے علاوہ انھوں نے ایسی خفیہ تنظیمیں قائم کرنی شروع کردیں جو عثمانی سلطنت کے خلاف کام کرتی تھیں۔ وہ انھیں اسلحہ اور مالی امداد مہیا کرتے تھے۔ ان کی پوری کوشش تھی کہ سلطنت عثمانیہ کو کمزور کر کے اس کے ٹکڑے کردیے جائیں، چنانچہ یورپ کے مختلف علاقوں میں عثمانیوں کے خلاف نافرمانی اور بغاوت کی تحریکیں شروع ہوگئیں۔ [3]

عثمانی سلطنت کے آخری دور میں، خاص طور پر عثمانی سلطان عبدالحمید دوم کے دور (1293ھ تا 1327ھ مطابق 1876ء تا 1909ء) میں روس اور یورپی ممالک کی امداد و تائید سے یورپ کے عثمانی صوبوں بلقان اور یونان وغیرہ میں کثرت سے شورشیں برپا ہونے لگیں۔ عثمانی گورنروں اور کمانڈروں نے اکثر شورشوں کا قلع قمع کردیا جس سے یورپ کی رائے عامہ عثمانیوں کے خلاف ہوگئی۔

1293ھ میں سلطنت عثمانیہ نے سربوں پر ایک شدید ضرب لگائی جنھوں نے عثمانیوں کو بلقان سے نکالنے کے لیے بہت سی فوج جمع کر لی تھی۔ اس میں عثمانیوں کو فتح حاصل ہوئی اور بلقان میں ان کے دشمنوں کا زور

---

[1] العثمانيون والروس: 117، و تاريخ الدولة العلية: 513. [2] تاريخ الدولة العلية: 610، و العثمانيون في التاريخ والحضارة: 203. [3] تاريخ الدولة العلية: 605.

سینٹ پیٹرز برگ (رُوس) میں دریائے نیوا میں ایک پُرانا فریگیٹ جہاز

ٹوٹ گیا۔ اس وجہ سے روس نے دوبارہ عثمانی سلطنت کے خلاف دشمنی کا اعلان کر دیا اور عثمانیوں سے جنگ کے لیے فوجیں جمع کر لیں۔ [1]

روس نے بین الاقوامی طور پر جوڑ توڑ کر کے عثمانیوں کو مجبور کیا کہ وہ یورپ کے بعض علاقوں سے عیسائیوں کے حق میں دست بردار ہو جائیں۔ اس سازش میں فرانس، برطانیہ اور آسٹریا شامل تھے۔ ان کے نمائندے 1294ھ (مطابق 1877ء) میں استنبول میں ایک کانفرنس میں شریک ہوئے لیکن کانفرنس کسی بات پر متفق ہوئے بغیر ختم ہوگئی۔ [2]

عثمانیوں کا اصرار تھا کہ یہ علاقے ان کے کنٹرول میں رہیں، البتہ مسلمانوں اور غیر مسلموں میں مساوات کی ضمانت دی جائے گی لیکن یورپیوں کا مطالبہ تھا کہ سلطنت عثمانیہ ان علاقوں سے غیر مشروط طور پر دست بردار ہو جائے، یعنی وہ سلطنت کی کمزوری سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ اس طرح ان علاقوں کے مسلمانوں کے لیے خطرہ پیدا ہوگیا کہ انھیں ظلم اور قتل و غارت کا نشانہ بنایا جائے گا۔ اس وجہ سے عثمانی سلطنت

---

[1] تاريخ الدولة العلية: 616، و العثمانيون والروس: 134. [2] تاريخ الدولة العلية: 619، و العثمانيون والروس: 135.

کو سخت موقف اختیار کرنا پڑا۔

انھوں نے عثمانی سلطنت پر دباؤ ڈالنے کے لیے دھمکی آمیز یادداشتیں ارسال کیں لیکن عثمانی اپنے موقف پر قائم رہے کہ وہ مشرقی یورپ میں اپنے علاقوں سے دست بردار نہیں ہوں گے، چنانچہ روس نے مکمل تیاری کے ساتھ سلطنت عثمانیہ کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ اس نے رومانیہ سے اتحاد کر لیا جو گزشتہ ایام میں سلطنت عثمانیہ کے تابع تھا، چنانچہ روس کے ایک لشکر جرار نے سلطنت عثمانیہ کی مشرقی سرحدوں پر حملہ کر دیا۔ اس جنگ میں رومانیہ روس سے مل گیا اور اس کے مسلمان باشندے ایک طرف سے روسی افواج اور دوسری طرف سے رومانیہ کے عیسائیوں کے درمیان گھر گئے۔ عثمانی افواج روسی حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے کے لیے میدان میں آ گئیں۔ استنبول کے علماء نے فتویٰ جاری کر دیا کہ جسے طاقت ہو، اس پر جہاد کرنا واجب ہے۔ سلطان عبدالحمید نے سلطنت کے تمام حصوں میں ملک کے حالت جنگ میں ہونے کا اعلان کر دیا اور اس پر زور دینے کے لیے اپنے نام کے ساتھ ''غازی'' کا لفظ شامل کر دیا۔ اس کا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ وہ جنگ میں بذاتِ خود شریک ہے۔ یہ رواج بعد کے ان عثمانی سلاطین میں بھی قائم رہا جنھوں نے جنگیں کیں۔ [1]

روسیوں نے دریائے ڈینیوب پار کیا اور عثمانیوں کے زیرِ انتظام بعض شہروں پر قبضہ کر لیا، مثلاً: ''تیرنوہ'' اور ''نیکوپولس'' جو اس وقت بلغاریہ میں شامل ہیں۔ علاوہ ازیں روسیوں نے بعض نازک مقامات پر اور بلقان جانے والے بعض راستوں پر قبضہ کر لیا۔ سلطان غازی عبدالحمید نے روسی حملے کا مقابلہ کرنے کے لیے فوج کی قیادت میں بڑی بڑی تبدیلیاں کر دیں۔ روسیوں نے ''پلونا'' کے شہر پر قبضہ کرنے کی کوشش کی جو آج کل بلغاریہ میں شامل ہے اور وہ بلقان کے راستے میں ایک اہم مقام ہے لیکن بہادر عثمانی کمانڈر

---

[1] تاريخ الدولة العلية: 628، والعثمانيون والروس: 134.

عثمان پاشا نے بڑی بہادری سے ان کا مقابلہ کیا اور وہ شکست کھا کر اُلٹے پاؤں بھاگ گئے۔ انھوں نے پہلے سے بڑا لشکر لے کر ایک بار پھر حملہ کیا۔ اس کے باوجود بے مثال عثمانی کمانڈر نے اس بار بھی ان کا حملہ پسپا کر دیا، چنانچہ سلطان نے اس کمانڈر کی تعریف میں ایک خاص تحریری فرمان جاری کیا۔[1]

جب روسیوں نے یہ ثابت قدمی دیکھی تو اس شہر پر قبضہ کرنے کے لیے انھوں نے اپنا طریقہ تبدیل کر لیا۔ اب انھوں نے محاصرے کا طریقہ اختیار کیا۔ انھوں نے کوشش کی کہ امدادی افواج عثمانی لشکر تک نہ پہنچ سکیں اور خود اپنی فوجی طاقت میں اضافہ کر لیا۔ زارِ روس اپنے مشہور ترین کمانڈروں کے ہمراہ آیندہ معرکے کی نگرانی کرنے کے لیے خود آ گیا۔ اس کی آمد سے روسی فوج کے حوصلے بلند ہو گئے۔ علاوہ ازیں رومانیہ کے حاکم نے غداری کی کیونکہ اس کے بارے میں یہ توقع تھی کہ وہ عثمانیوں کا ساتھ دے گا یا کم از کم غیر جانب دار رہے گا۔ لیکن وہ اپنی فوج کو لے کر جس کی تعداد تقریباً ایک لاکھ تھی، روسیوں سے مل گیا، لہٰذا جنگ کا پلڑا روسیوں کی طرف جھک گیا کیونکہ اب ان کی تعداد ڈیڑھ لاکھ ہو چکی تھی۔ انھوں نے عثمانی فوج کا محاصرہ کرتے ہوئے تین دائرے بنائے۔ اس کے باوجود عثمانی فوج عثمان پاشا کی قیادت میں بہادری سے ڈٹی رہی۔ اگرچہ ان کی تعداد صرف پچاس ہزار تھی، پھر بھی انھوں نے اپنی جگہ قائم رہنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ محاصرہ کرنے والے دشمنوں پر حملے کا ایک عمدہ منصوبہ تیار کیا۔ ان کا عزم تھا کہ محاصرہ توڑ کر فتح حاصل کریں گے یا شہادت کا شرف پالیں گے۔

عثمان پاشا نے اپنی فوج کی قیادت کی۔ مجاہدین کلمہ پڑھتے ہوئے اور نعرۂ تکبیر لگاتے ہوئے اپنے دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ بہت سے مجاہدین روسی فوج کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔ انھوں نے محاصرہ کرنے والوں کا پہلا اور دوسرا دائرہ توڑ دیا اور ان میں موجود توپوں پر قبضہ کر لیا۔ تیسرے دائرے کے قریب عثمان پاشا کو کچھ زخم آ گئے تو اس کی فوج میں اس کی شہادت کی افواہ پھیل گئی جس سے ان کی کمرِ ہمت ٹوٹ گئی۔ انھوں نے شہر میں واپس آنے کی کوشش کی لیکن کچھ روسی فوجیں شہر میں داخل ہو گئیں۔ اس طرح عثمانی لشکر دشمن کی مختلف توپوں کی گولہ باری کے درمیان پھنس گیا، چنانچہ وہ روسی فوجوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے۔ یہ واقعہ 1294ھ میں، یعنی 1877ء کے آخر میں پیش آیا۔ عثمانی کمانڈر نے شدید زخمی ہونے کی وجہ سے خود کو روسیوں کے سپرد کر دیا جو اس کی بہادری پر حیران تھے اور اس کی شجاعت اور پیش قدمی کی

---

[1] تاريخ الدولة العلية: 631 و السلطان عبد الحميد الثاني، حياته وأحداث عهده: 133.

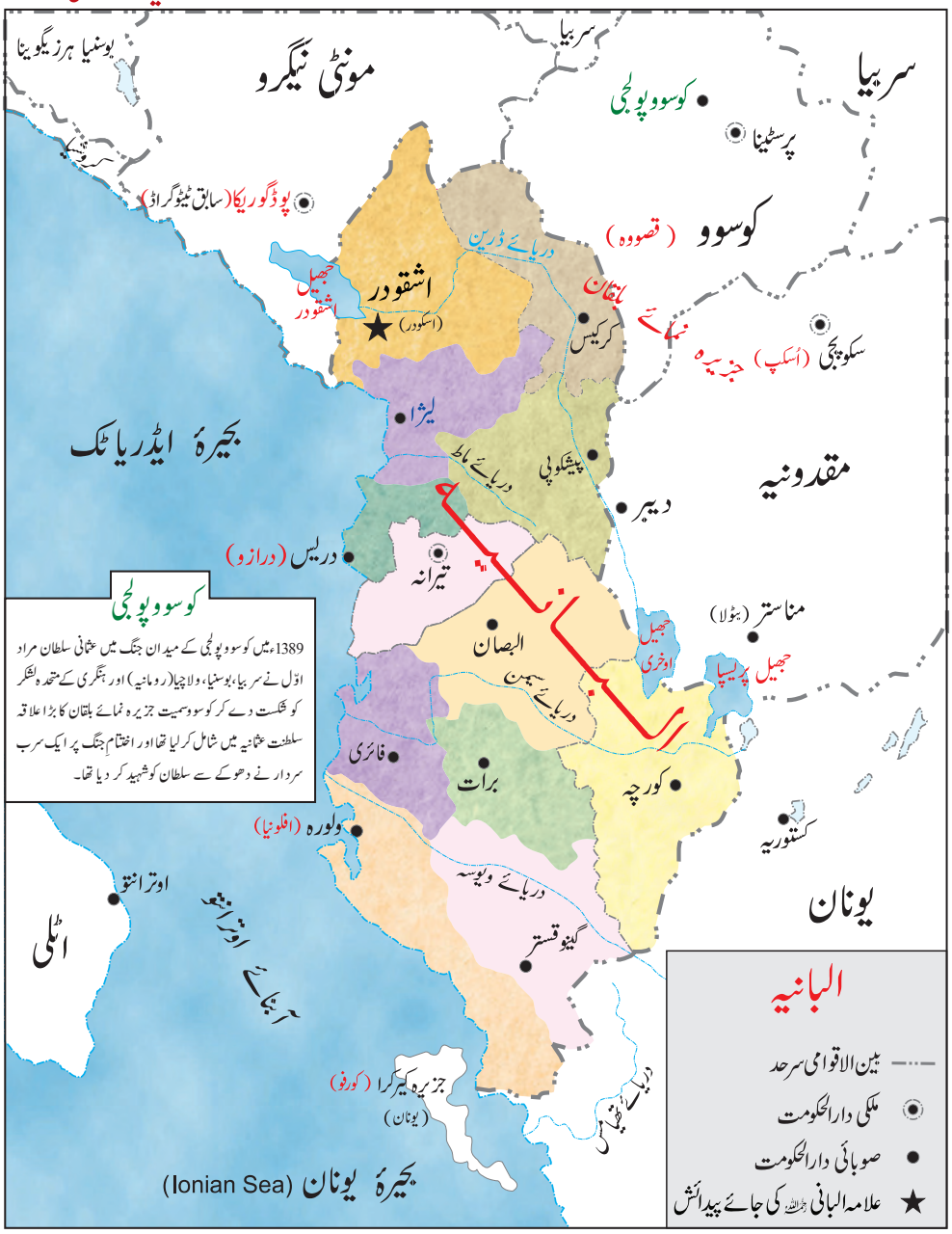

تعریف کر رہے تھے۔[1]

روسیوں کی ان فتوحات سے بلقان میں سربوں کو عثمانیوں کے خلاف اٹھنے کی ہمت ہوئی۔ انھوں نے

---

[1] تاریخ الدولة العلية:634، و العثمانيون و الروس:136 و السلطان عبدالحميد:133.

وولگا بلغار (روس) کی سفید مسجد

وہاں کی عثمانی چوکیوں پر حملہ کر دیا۔ اس طرح روسیوں سے ان کی توجہ ہٹ گئی جو نئے علاقوں پر قبضہ کرنے کی فکر میں تھے اور واقعی روسیوں نے بلغاریہ کے موجودہ دارالحکومت ''صوفیہ'' پر قبضہ کر لیا۔ روسیوں نے اس پر بس نہ کی بلکہ جنوب میں عثمانی دارالحکومت ''استنبول'' کی طرف بڑھے اور عثمانیوں کے سابقہ دارالحکومت ''ادرنہ'' پر قبضہ کر لیا۔ وہ ان مقامات تک پہنچ گئے جو استنبول سے صرف پچاس کلومیٹر دور تھے۔ اس طرح عثمانی دارالحکومت کی اندرونی حالت انتہائی نازک ہوگئی۔

اس دوران میں روسیوں اور عثمانیوں کے درمیان ایشیا میں بھی جنگ جاری تھی۔ روسی اناطولیہ تک پہنچ چکے تھے۔ اس کے باوجود عثمانی انھیں شکست دے کر واپس روسی علاقے میں دھکیلنے میں کامیاب ہوگئے۔ عثمانیوں نے ''احمد مختار پاشا'' کی قیادت میں چھ سے زیادہ معرکوں میں روسیوں پر فتح حاصل کی۔ اسی وجہ سے سلطان عبدالحمید نے اس کی تعریف میں شاہی فرمان جاری کیا۔ روسیوں نے ان علاقوں پر دوبارہ حملہ کیا اور 1295ھ میں عثمانیوں کی افواج کو یورپ اور ایشیا میں شکست دے دی، چنانچہ عثمانی سلطنت کو روس سے جنگ بندی کرنی پڑی اور ان سے مذاکرات کرنے پڑے، چنانچہ فریقین میں ''سان سٹیفانو'' کا معاہدہ طے پایا، جس کے نتیجے میں عثمانی سلطنت کو یورپ میں اپنے اکثر علاقوں سے محروم ہونا پڑا جن میں بلقان،

رومانیہ اور بلغاریہ بھی شامل تھے۔ علاوہ ازیں عثمانیوں کو پابند کیا گیا کہ وہ روس کو جنگ میں ہونے والے نقصانات کا معاوضہ ادا کریں۔ یہ معاہدہ عثمانیوں کی ایسی تذلیل تھی جس کی ماضی میں کوئی مثال نہیں ملتی۔

یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ (عثمانیوں کی شکست کے) ان واقعات سے کچھ ہی عرصہ پہلے عثمانی سلطنت میں ایک خطرناک تبدیلی آئی تھی۔ وہ یہ کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں میں مساوات کا اعلان کر دیا گیا اور تمام عثمانی رعایا کو بلا امتیاز ملک کے برابر کے شہری تسلیم کیا گیا جس کے نتیجے میں بعض عیسائی بھی فوج میں بھرتی ہو گئے۔ عثمانیوں کو ہونے والی شکستوں میں ان کا واضح کردار رہا، تاہم عثمانیوں کی صفوں میں ایسے افراد موجود تھے جنھوں نے اسلام کے لیے جنگ کی کیونکہ انھیں پوری طرح احساس تھا کہ روس نے عثمانیوں سے جو جنگ لڑی ہے، ان میں عیسائی مذہبی جذبات ہی کارفرما تھے۔ اسی طرح اس دور میں عام یورپیوں کی عثمانیوں سے جنگ خالصتاً مذہبی جنگ تھی اگرچہ ان کے ممالک آزادی، ترقی پسند سوچ اور مساوات جیسے دلکش نعرے لگاتے تھے۔

اس معاہدے کے نتیجے میں عثمانی کمزور اور لاچار ہو گئے۔ اس کے باوجود روس کے قبضے میں جانے والے علاقوں کے مسلمان روسیوں پر شدید دباؤ کا باعث بنے رہے۔ ان علاقوں کے مسلمانوں کو یورپ کی نظروں کے سامنے عیسائیوں کے ہاتھوں قتل عام کا سامنا کرنا پڑا۔ کئی ملین مسلمان ہجرت کر کے عثمانی سلطنت کے اندرونی علاقوں میں چلے آئے۔ وہاں وہ پناہ گزینوں کی حیثیت سے استنبول کی حکومت پر ایک بڑا بوجھ بن گئے۔ اس ہجرت کی وجہ سے مقبوضہ علاقوں میں مسلمانوں کی تعداد کم ہوتی چلی گئی اور ان کی قوت کمزور ہو گئی، چنانچہ وہاں عیسائیوں کا تسلط مضبوط ہو گیا۔ یورپ کے دوسرے ممالک علاقے میں روس کا اثر و نفوذ کم کرنے کے خواہش مند تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ عثمانی حکومت کو بھی ختم کرنا چاہتے تھے۔ پہلی جنگ عظیم نے انھیں یہ موقع فراہم کر دیا۔ اس دوران میں صرف جنگ گیلی پولی (1915ء) میں ایک لاکھ 89 ہزار ترکوں نے شہادت پائی، تاہم اس وقت تک ''ترک قومیت'' کا تصور عثمانی سلطنت کو کرم خوردہ کر چکا تھا، چنانچہ عربی اور غیر عربی قومیتیں اس پر ٹوٹ پڑیں۔ جب عثمانیوں کی اسلامی شناخت ختم ہو گئی تو وہ بے حیثیت ہو گئے۔ ترکی اور اس کے عوام زوال کی پستیوں میں اترتے چلے گئے۔ یہ سلطنت وہ تھی جو صدیوں تک ایشیا کی سب سے طاقتور اسلامی سلطنت رہی تھی اور دسویں صدی ہجری میں یورپ کی مضبوط ترین سلطنت تھی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے اسلام کو ضائع کیا تو خود ضائع ہو گئے اور اسلام باقی ہے۔ اور ان شاء اللہ وہ قوم بھی آئے گی جو اسلام کا پرچم بلند کرے گی۔

حرفِ آخر

اسلامی جہاد کی تاریخ اور مختلف ادوار میں اس کی پیش قدمی کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک سے لے کر اس جہانِ فانی کے اختتام تک اسلامی جہاد کے کچھ خاص مقاصد رہے ہیں اور رہیں گے۔ ان میں سرفہرست مقصد اسلام کا پیغام تمام انسانیت تک پہنچانے کے لیے علاقے فتح کرنا اور پہلے سے فتح شدہ علاقوں کی حفاظت کرنا ہے۔ ہر دور میں جہادی تحریکوں کے یہی دو مقاصد رہے ہیں۔

جہاد کے اولین اقدامات رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ مقدسہ میں شروع ہوئے۔ یہ جہاد کسی خاص قوم سے نہیں تھا بلکہ اسلام کے ہر مخالف سے تھا جن میں سرفہرست رسول اللہ ﷺ کا اپنا قبیلہ قریش تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے جہاد کا بڑا حصہ قریش کے خلاف تھا اور اس جہاد کا دوسرا بڑا ہدف یہود تھے۔ آپ ﷺ نے دعوت اور جہاد کے سلسلے میں ان دونوں فریقوں میں کوئی فرق نہیں کیا بلکہ انھیں برابر رکھا۔

یہ امر بھی نمایاں ہے کہ جہاد کی تحریک اسلام کے مختلف ادوار میں سے کسی دور میں موقوف نہیں ہوئی۔ اگر ایک قوم اس سے دست کش ہوئی تو دوسری قوم نے یہ فریضہ سنبھال لیا، جیسے عباسی دور کے آخر میں جب بنوعباس نے جہاد چھوڑ دیا تو غزنویوں، زنگیوں اور ایوبیوں نے جہاد کا علم اٹھا لیا۔ اسی طرح جب عرب اس سے دست بردار ہوئے اور نظروں سے اوجھل ہو گئے تو عثمانی ترک اس کے علم بردار بن گئے کیونکہ اسلامی جہاد کسی خاص قوم یا کسی خاص جماعت سے وابستہ نہیں ہے۔

اس مطالعے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اکثر اوقات دشمن کے حملوں سے اسلامی علاقوں کا دفاع کرنا، انھیں فتح کرنے سے زیادہ مشکل ثابت ہوا ہے، اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کو کئی علاقے دوبارہ یا کئی بار فتح کرنا پڑے۔

اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ جہادی تحریکوں کی کامیابی کا دارومدار شریعتِ اسلامی کی تعلیمات

پر پابندی سے عمل پیرا رہنے میں ہے۔ ان میں سب سے زیادہ اہمیت قوت حاصل کرنے اور دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے ہر وقت افرادی قوت اور اسلحہ تیار رکھنے کو حاصل ہے۔ جو قائدین اس چیز کو پیش نظر رکھتے ہیں، اسلام کے دشمن سے جہاد میں وہی کامیاب ہوتے ہیں۔

اس مطالعے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ رضا کار مجاہدین جو باقاعدہ فوج کا حصہ نہیں ہوتے بلکہ صرف دینی جذبے کے تحت میدان میں آتے ہیں، وہی جہاد کا زیادہ شوق رکھتے ہیں اور جہاد کے دوران میں شہید ہونے والوں میں بھی زیادہ تعداد انھی کی ہوتی ہے اور طاقتور قائدین کے ساتھ ایسے افراد زیادہ تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ امت کے دلوں میں مخلص مجاہدین کا ایک خاص مقام ہمیشہ رہا ہے اور اب بھی ہے۔ خواہ کتنا طویل عرصہ گزر جائے، ہم سیدنا خالد بن ولید، مثنیٰ بن حارثہ اور ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہم ایسے حضرات کو کبھی نہیں بھول سکتے۔ اسی طرح عقبہ بن نافع رحمہ اللہ، محمد بن قاسم، قتیبہ بن مسلم، طارق بن زیاد، محمود غزنوی، الپ ارسلان، عماد الدین زنگی، نورالدین محمود زنگی، صلاح الدین ایوبی، سیف الدین قُطز، سلطان محمد فاتح (رحمۃ اللہ علیہم اجمعین) اور ان جیسے دیگر مجاہدین کو فراموش کرنا ممکن نہیں جن کے صالح اور مجاہد ہونے کی گواہی پوری امت دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سب پر رحمت نازل فرمائے! اسی وجہ سے اسلامی تاریخ کے مصادر و مراجع میں انھیں بہت اہمیت دی گئی ہے اور ان کی تعریف کی گئی ہے۔

علاوہ ازیں اس مطالعے سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ اسلام کے دشمن مسلمانوں سے لڑنے سے باز نہیں آتے، خواہ مسلمان ان سے لڑنا چھوڑ دیں۔ اس کی سب سے بڑی مثال صلیبی جنگوں کی صورت میں ہمارے سامنے ہے جب فرنگیوں نے جزیرہ نمائے عرب کے درمیان تک اور حجازِ مقدس تک پہنچنے کی کوشش کی تھی۔

امت کی موجودہ حالت اور اس کی گزشتہ تاریخ میں یقیناً ایک واضح تعلق ہے۔ مغرب کی عیسائی دنیا، یہود اور کفر کی مختلف قوتوں سے مسلمانوں کی آویزش حقیقت میں اسی کشمکش کا تسلسل ہے جو رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ مقدسہ سے عثمانی دور کے آخر تک جاری رہی بلکہ آج تک جاری ہے۔ مسلمان آج بھی وہی اسباب و ذرائع اختیار کر کے اپنے دشمنوں پر فتح پاسکتے ہیں جن کے ذریعے سے انھوں نے ماضی میں فتوحات حاصل کی تھیں۔ ان کو ایک نکتے میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ اسلام کو جزوی طور پر نہیں بلکہ پورے کا پورا قبول کیا جائے کیونکہ اسلام نے ہمیں قوت اور غلبہ حاصل کرنے کے لیے جو ہدایات دی ہیں، ان میں جہاد اور اس کے مختلف اصول وضوابط سب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔

ہم آج ایسی دنیا میں زندگی گزار رہے ہیں جس میں صرف طاقتور ہی احترام کا مستحق سمجھا جاتا ہے جو حالات کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ قوت کا مطلب ظلم و تعدی نہیں بلکہ دفاع کی طاقت ہے اور اکثر اوقات پہل کرنا ہی دفاع کا اہم ترین ذریعہ ثابت ہوتا ہے۔ یہ اصول دور اول کے مجاہدین نے سمجھ لیا تھا اور یہی اصول آج کی بعض اسلام دشمن طاقتوں نے سمجھا ہے۔

جہاد کی تحریکیں بہت زیادہ ہیں۔ انھیں اختصار کے ساتھ بیان کرنا بھی بہت مشکل ہے لیکن میں نے کوشش کی ہے کہ ہر دور سے کچھ مثالیں لے لوں تاکہ ہم اس دور کی بعض جہادی تحریکوں کو جان سکیں۔ اس کے علاوہ امت کے کتنے ہی گمنام مجاہدین ہیں جن کا ذکر تاریخ کی کتابوں میں نہیں ملتا لیکن اللہ کے پاس ان کا اجر وثواب بہت عظیم ہے اور ان کے کارنامے اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کتاب میں درج ہو چکے ہیں جس کے بارے میں اس نے فرمایا:

﴿لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا﴾

''وہ نہ کسی چھوٹے عمل کو چھوڑتی ہے، نہ بڑے عمل کو بلکہ سب کو شمار کر لیتی ہے۔'' (الکھف 49:18)

میں نے کوشش کی ہے کہ واقعات تحقیق کر کے بیان کیے جائیں۔ جہاد فی سبیل اللہ کی تحریک کے دوران میں جو واقعات پیش آئے ہیں، میں نے ان کے بارے میں اسلامی اور علمی نقطہ نظر پر اپنے موقف کی بنیاد رکھی ہے۔ میں نے تاریخی واقعات کی وضاحت کرتے ہوئے بعض گزشتہ اور موجودہ مصنفین کے کلام پر تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ اس مبارک تحریک کو محض تاریخی واقعات کے طور پر بیان کرنے پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ اس سے اسباق اخذ کیے جائیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ امت کے مجاہدین اور ان کی مدد کرنے والوں پر رحمت فرمائے۔ اس کے لشکر کو عزت اور غلبہ عطا فرمائے اور ہمیں ان لوگوں میں شامل کر دے جنھیں اللہ نے اسلام کی وجہ سے عزت بخشی اور ان کی جدوجہد سے اسلام کو قوت بخشی۔